قرآن

عربی زبان کا ایک زبردست معجزہ

بسام ساعی

قرآن

عربی زبان کا ایک زبردست معجزہ

بسام ساعی

مترجم
طاہر محمود

اِنسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز، نئی دہلی ۲۵

قرآن: عربی زبان کا ایک زبردست معجزہ

﴿The Miraculous Language of the Qur'an
Evidence of Divine Origin﴾

By: **Bassam Saeh**

©جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ
(اس کی جزوی طباعت بھی پہلے سے حاصل کردہ تحریری اجازت کے بغیر ممنوع ہے)

مصنف کے افکار و خیالات سے ناشر/تقسیم کار یا پرنٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

ISBN: 978-93-80946-27-6

مترجم	:	طاہر محمود
کل صفحات	:	124
سال اشاعت	:	2019
قیمت	:	Rs. 120/-
تزئین کار	:	محمد اطہر حسین (آئی او ایس)
مطبع	:	بھارت آفسیٹ، گلی قاسم جان، دہلی۔۱۱۰۰۰۶

ناشر

انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز
162، جوگا بائی، جامعہ نگر، نئی دہلی-110025

ملنے کا پتہ

الاتحاد پبلیکیشنز (پرائیویٹ) لمیٹیڈ
B-35، نظام الدین (ویسٹ)، نئی دہلی-110013
Tel.: 91-11-41827475, 24352732 Fax.: 91-11-24352048
E-mail: alittehad@gmail.com

فہرست

عرض مترجم 7

پیش لفظ 9

مقدمہ: قرآن کی آفاقی صداقت 11

قرآن: عربی زبان کا ایک زبردست معجزہ 15

معجزہ یا محض ذکاوت انسانی؟ 20

قرون اولیٰ کے مسلمان مفکرین اسی اصطلاح ''اعجاز'' سے کیا معنی مراد لیتے تھے؟ 22

رسول اللہ ﷺ کے زمانہ کے عربوں پر قرآن کی جدت وندرت کا اثر 26

قرآن کی لسانی جدت میں آشکار ''اعجاز'' کی حقیقی حد 27

قرآن کی جدت طرازیوں کا معجزاتی تواتر 29

قرآن کی نئی سریلی لسانی تعمیر کا عرب سامعین کو تذبذب میں مبتلا کر دینے والا اثر 30

مجھے عہد ماضی میں پہنچا دینے والی مشین 31

تین اقسام کا ذخیرۂ الفاظ: قرآنی، زمانہ قبل اسلام کا، اور نبوی ﷺ الفاظ کا ذخیرہ 34

نیا اسلوبی انقلاب 35

سورتوں کا قرآنی تشخص 37

کیا مختلف سورتوں کے خواص ایک دوسرے پر سایہ فگن ہیں؟ 39

سورۃ الاعلیٰ (87) اور سورۃ اللیل (92) 39

قرآن کا منفرد وصف 40

جدید لسانیاتی تشکیل 45
انتہائی نادر قرآنی تراکیب 48
قرآنی لسانی سانچے۔ان کا مزاج اور ترتیب 51
وہ انداز واطوار جو نبی کریم ﷺ کی بول چال کا خاصہ تھے 56
تراکیب اور اظہار بیان کی جدت 59
قرآنی تراکیب 60
تختی 1: قرآنی نئی تراکیب بمقابلہ عام عربی تراکیب 60
تختی 2: سورۃ مدثر کی 12 نئی تراکیب 62
تختی 3: سورۃ مدثر میں 65 نئی تعبیرات 63
انفرادی الفاظ اور جدت وسلاست کی آمیزش کا معجزہ 67
قرآن میں پائی جانے والی نئی اصطلاحات کی اہمیت 68
سورۃ المدثر میں موجود نئے الفاظ 74
سورۃ المدثر میں اُدوات (Particles) کا نیا استعمال 75
لسانی اکائی کی ترتیب نو 77
روایتی اُدوات وصل وفصل کی نئی صورت حال 79
جدید بین الالفاظ تعلق 82
تشبیہات کی جدید قرآنی لغت 84
کثیر الجہتی تمثیلات 86
نادیدہ حقیقتوں کی منظر کشی 87
(سورۃ المدثر 74) میں پائی جانے والی منظر کشی کی قسمیں 89
الالتفات (طرزِ خطاب کی تبدیلی) 91

وقت کے تعلق سے التفات (طرزِ خطاب کی تبدیلی) 94
مفعول کی حالت میں التفات (طرزِ خطاب کی تبدیلی) 96
وسعتِ زبان ومطالب 100
سورۃ المدثر میں ''وسعت زبان'' کی مثالیں 105
تختی نمبر 5: کثیر المعانی الفاظ وکلمات کی چند مثالیں 106
قرآن کے مختلف طریقہ ہائے تلاوت اور بلاغت زبان 108
وسعت زبان اور سائنسی انکشافات 110
ملاحظات 116
منتخب حوالہ جات 120
عربی حوالہ جات 120
انگریزی حوالہ جات 122
English References 123

اس کتاب میں پیش کردہ خیالات اور آراء، مصنف کی ذاتی رائے پر مشتمل ہیں، جن ویب سائٹس کا حوالہ اس کتاب میں دیا گیا ہے ان کی موجودہ یا آئندہ صحت، یا مصدقہ ہونے کی کوئی ذمہ داری ناشر پر عائد نہیں ہوتی۔ اس بات کی کوئی ضمانت نہیں دی جا سکتی کہ ان ویب سائٹس کے مندرجات اِس وقت یا مستقبل میں بھی مصدقہ اور مناسب حال رہیں گے۔

عرض مترجم

کسی بھی انگریزی کتاب کو پڑھ کر اسے اردو کے قالب میں ڈھالنے کی ایسی شدید خواہش میں نے اپنے دل و دماغ میں محسوس نہیں کی جتنی اس کتاب The Mirculous Language of the Qura'n کو پڑھ کر ہوئی۔

اصل کتاب عربی زبان میں ''المعجزۃ'' کے عنوان سے ہے اور اس کے فاضل محقق ومصنف جناب احمد بسام ساعی ہیں۔ انگریزی ترجمہ نینسی رابرٹس صاحبہ نے کیا ہے۔ یہ اصل کتاب کی جلد اول کی تلخیص کا ترجمہ ہے پھر بھی پوری تحقیق کا نچوڑ اس میں سمونے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ انگریزی ترجمہ بھی **المعهد العالمي للفكر الاسلامي** (International Institute of Islamic Thought - IIIT) نے لندن اور واشنگٹن سے طبع کیا (2015ء)۔ اصل عربی کتاب اسی ادارہ نے 2013ء میں طبع کی تھی۔

IIIT ورجینیا کے کتب خانہ میں موجود انگریزی ترجمہ کے عنوان اور مندرجات نے مجھے اس قدر متاثر کیا کہ میں نے اسے اردو کے قالب میں ڈھالنے کا پختہ ارادہ کر لیا تا کہ اس کتاب کے فیوض و برکات برصغیر کے ان کروڑوں لوگوں تک بھی پہنچ جائیں جو صرف اردو زبان سے واقف ہیں۔

کسی بھی ادب پارے کو دوسری زبان میں ترجمہ کرنے پر اصل زبان کی چاشنی اور تاثیر کم ہو ہی جاتی ہے پھر بھی ناول یا شاعری کے ترجمہ کے مقابلہ میں دینی کتاب کے ترجمہ میں اولیت نفس مضمون کی ہونی چاہیے۔ اسی ذاتی رائے کی روشنی میں اپنی بساط بھر کوشش کی ہے کہ اصل متن سے قریب ترین مطلب اس ترجمہ کے ذریعہ آپ تک پہنچ جائے۔ اس لحاظ سے مجھے امید ہے کہ یہ کتاب اپنی پوری افادیت کے ساتھ قارئین تک پہنچی ہے۔ پھر بھی زبان و بیان کی جو خامیاں آپ کو نظر آئیں براہ مہربانی ان سے درگزر فرمائیں۔

اللہ رب العزت کی بارگاہ میں دست بدعا ہوں کہ اس کے زندہ معجزہ ''قرآن کریم'' کی اس معمولی خدمت کو قبول فرمالے۔ آمین! آپ سے بھی عاجزانہ درخواست ہے کہ خاکسار کو دعائے خیر سے نوازیں۔

اس کتاب کو انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرنے کی اجازت دینے سے لے کر اس کی اشاعت تک کے مراحل کی تکمیل میں IIIT-VA (آئی آئی آئی ٹی۔ ورجینیا) کے ڈاکٹر اقبال یونس صاحب، انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز، نئی دہلی ہندوستان کے منتظمین ڈاکٹر محمد منظور عالم صاحب اور ابراہیم عالم صاحب کی کوششوں اور تعاون کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔

طاہر محمود

اسٹرلنگ ورجینیا۔ شمالی امریکہ

Email: tahir.mahmood@me.com

پیش لفظ

تمام انسانیت سے عمومی طور پر، مگر مسلمانوں سے خصوصی طور پر یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ قرآن کریم کے پیغام پر سنجیدگی سے غور کریں اور اسے ایک الہامی کتاب کا وہ حقیقی درجہ دیں جس کا قرآن کریم بجا طور پر مستحق ہے۔

زیر نظر مطالعہ میں فاضل مصنف نے اس مقدس کتاب الٰہی کے لسانی لحاظ سے مختلف معجزاتی پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ یہ بھی وضاحت کرنے کی سعی کی ہے کہ رسول کریم حضرت محمد ﷺ کے نطق پاک سے قرآن کی نورانی آیات سن کر ساتویں صدی عیسوی کے عربوں کی سماعت اس نئے اور عجیب وغریب کلام کی خوبصورتی سے دنگ کیوں رہ گئی تھی۔ عربی زبان کے ماہر کی حیثیت سے، اور اسی وجہ سے عربی زبان کی کئی صدیوں پر محیط ''تربیت'' کی وجہ سے ان کے دل و دماغ پر اس کلام الٰہی کا اثر کسی دوسرے انسانی کلام کے اثر سے کئی گنا زیادہ تھا۔ وحی آسمانی کا صوتی اور لسانی جمالیاتی پہلو اپنی جگہ یقیناً بہت اعلیٰ وارفع ہے، لیکن ''قرآن مجید'' اس ایک پہلو سے قطع نظر بھی ایک بلند و بالا، معجزاتی، افضل شے ہے۔ بلا مبالغہ اس کی زبان کی ذکاوت، شوکت، نغمگی اور اظہار کا تال میل، اس کی ماقبل تاریخ سے لے کر زمانۂ نزول تک کے تمام نثری اسالیب کے مقابلہ میں قطعاً ناشنیدہ ''طرز کی عبارت کے ساتھ ساتھ نئے الفاظ کے تعارف نے قرآن کو ابد آباد تک کے لیے ایک کامل نمونہ بنا دیا جس میں کسی معمولی اضافہ کی بھی گنجائش نہیں ہے۔ اس نے نزول کے پہلے دن سے پوری قوت کے ساتھ اانسانی دانش اور رویہ پر اثر کرنا شروع کیا، جس نے عربی زبان کو ایک بے مثال تبدیلی ہی سے روشناس نہیں کیا، بلکہ انسانی شعور کو ایک پرشکوہ اعلیٰ تصور بھی دیا۔ جس نے انسانی شعور کی ایک اعلیٰ ترین منزل تک رہنمائی کی۔ یہ کتاب قرآن کریم کے خصائل وفضائل میں سے چند لسانی خوبیوں کو بیان کرنے کی ایک کوشش ہے۔ فاضل مصنف نے یقیناً نفس مضمون پر گہرا غور وخوض کیا ہے اور ان کی تمام کاوش

اس ایک مرکزی سوال کا جواب حاصل کرنے پر مرکوز ہے کہ ''قرآنی زبان میں آخر ایسی کیا خوبی ہے جو اسے ایک لسانی معجزہ کا درجہ عطا کرتی ہے؟''

یہ اردو ترجمہ اصل کتاب کے انگریزی ترجمہ سے کیا گیا ہے۔ اصل کتاب عربی میں ہے، جس کا عنوان ہے ''المعجزۃ'' جلد اول، (IIIT, 2012)، کتاب کے مخاطب عام قاری ہیں جن کے لیے عربی زبان میں اتنی مہارت ضروری نہیں ہے کہ وہ زیر بحث قرآنی زبان کی تکنیکی وفنی خوبیوں کو سمجھنے سے مطلقاً قاصر رہ جائیں۔ یہ ضرور ہے کہ عربی زبان پڑھ لینے کی حد تک صلاحیت یقیناً فائدہ مند ہوگی۔ (دنیا کے کسی کونے میں بھی بسنے والا شاذ و نادر ہی کوئی مسلمان ہوگا جو قرآن پڑھنا نہ جانتا ہو، چاہے براہ راست سمجھتا نہ ہو۔ مترجم) مصنف بسام ساعی صاحب قاری کی رہنمائی اس طرح کرتے ہیں کہ وہ قرآنی زبان و بیان کی جمالیاتی خوبیوں کا ادراک کر سکے اور ان اوصاف میں غرق ہو کر قرآنی آیات کی تشکیل و روانی کو بہتر طریقہ سے سمجھ سکے۔ سورۃ مدثر (سورۃ نمبر 74) پر خصوصی توجہ مرکوز کرتے ہوئے مصنف اپنے تجزیہ سے کلام پاک میں ایک نئی روح پھونک دیتا ہے اور انکشاف کرتا ہے کہ قرآن مجید بحیثیت ایک مکمل کتاب ''معجزہ'' ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی ہر سورت میں بھی چند ایسے اوصاف کا اظہار کرتا ہے جو ایک سورت کو قرآن ہی کی دوسری سورتوں سے نہ صرف ممیّز کرتے ہیں بلکہ ہر سورت اپنی جگہ ایک معجزہ نظر آتی ہے۔

قرآن کریم کا کتنا ہی اور کسی بھی پہلو سے مطالعہ کیا جائے، اس کی خوبیوں کا پورا ادراک ممکن نہیں ہے۔ پھر بھی، اللہ تعالیٰ کی کتاب مقدس ''قرآن'' کو بہتر طور پر سمجھنے اور اس سے ایک قریبی تعلق استوار کرنے کے لیے یہ کتاب یقیناً ایک ناگزیر معاون ہے۔ آیات کا اردو ترجمہ زیادہ تر مولانا محمود الحسن عثمانی صاحب کے ترجمۂ قرآن سے لیا گیا ہے۔ انگریزی ترجمہ میں نینسی رابرٹس صاحبہ نے محمد اسد صاحب کے ترجمۂ قرآن The Massage of The Qura'n اور عبداللہ یوسف علی صاحب کے ترجمۂ قرآن The Meannig of the Holy Qura'n سے استفادہ کیا تھا۔

جہاں جہاں سن اور تاریخ کے حوالہ کی ضرورت پڑی ہے، وہاں ہجری سن کے لیے ''ھ'' اور عیسوی سن کے لیے ''ع'' کی علامت دی گئی ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہمیں کچھ علم نہیں سوائے اس علم کے جو آپ نے ہمیں سکھا دیا ہے (قرآن مجید 2:32)

مقدمہ

قرآن کی آفاقی صداقت

اس حقیقت سے تو کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ قرآن مجید ایک ادبی شاہکار ہے۔ یہ حقیقت بھی ناقابل تردید ہے کہ جزیرہ نمائے عرب میں بسنے والے 7 ویں صدی عیسوی کے عربوں سے لے کر موجودہ زمانہ کے عربوں کو بھی ایسی منفرد، بے مثال، ہر لحاظ سے مکمل، باکمال زبان سے سابقہ پیش نہیں آیا، جو اپنے طرز بیان، روانی وسلاست اور زور آوری میں اس جیسی ہو۔ ایک نکتہ بہرحال زیر بحث آ سکتا ہے کہ کیا قرآن واقعی ایک معجزہ ہے؟ یا دوسرے الفاظ میں یہ اسی دنیا کی تخلیق ہے یا اس کا تعلق کسی ماورائی جہت سے ہے؟ اس کے ''حکم الٰہی'' ہونے کی شہادت انسانی علم کے کثیر الجہتی اور تہہ در تہہ اضافوں سے ملتی رہتی ہے جو صدیوں پر محیط عرصہ میں انسانی علم وشعور نے قرآن کے تجزیہ میں صرف کر کے کیے ہیں۔ مگر موجودہ تحقیق کے مقاصد میں ایک خصوصی مقصد مختصر ''قرآنی الفاظ'' ہیں، جن کا کما حقہ ادراک انسان کو موجودہ زمانہ تک بھی نہیں ہو سکا ہے اور یہی خاص عنصر ہماری توجہ کو اس حقیقت کی طرف مبذول کراتا ہے کہ قرآن کی زبان ایک معجزہ ہے جس کا تعلق عالم بالا سے ہے۔

قرآنی زبان کا کسی انسانی، اعلیٰ ترین تخلیق سے بھی ممیّز ہونا یہ بات صاف صاف بیان کرنے کا ایک اور طریقہ ہے کہ نبی کریم ﷺ محض اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے آخری پیغام کو دنیا والوں تک پہنچانے کا ایک ذریعہ تھے اور ان کے زمانہ سے لے کر آج تک کوئی بڑے سے بڑا عربی زبان داں جو ادبیات، خطابت اور شاعری کا مانا ہوا ماہر ہی کیوں نہ ہو ''اس جیسی ایک سورت'' (10:38) تخلیق نہیں کر سکا۔ قرآن کا یہ پر اعتماد دعویٰ کہ: 'ہے کوئی جو اس کو غلط ثابت کر کے

دکھائے، نہ صرف ایک کامل دانشورانہ اپیل اور ناقدین کے لیے ایک کھلا چیلنج ہے، جو آنے والی تمام صدیوں کی ترقی یافتہ عقل و دلیل کی اپنی طرف توجہ مبذول کراتا ہے، بلکہ یہ حقیقت بھی اتنی ہی اہم ہے کہ یہ عظیم دعویٰ کس قدر سادگی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

اس دعویٰ کا جواب کیا موصول ہوا؟ قرآن کے اس دعویٰ کے سلسلہ میں دو اہم حقائق زمانہ کے امتحان پر پورے اترے ہیں۔ یہ حقائق لسانی ماہرین کے اس گروہ کو سخت تکلیف دہ الجھن میں مبتلا کر دیتے ہیں جو قرآن کی لسانی عظمت کو تو تسلیم کرتے ہیں لیکن اس کے منزل من اللہ ہونے میں انہیں پھر بھی سخت تردد ہے۔ ان دونوں حقائق کو کسی بھی مباحثہ کا جزلاینفک ہونے کے باوجود ناقدین بڑی آسانی سے نظرانداز کر جاتے ہیں:

1۔ قرآن کریم کی چھ ہزار سے زیادہ آیات میں کہیں بھی کوئی ذرا سی بھی غلطی نہیں نکال پایا (انتہائی شعوری کوششوں کے باوجود)۔

2۔ نزول قرآن کی ابتدا سے لے کر آج تک تاریخ کے مختلف ادوار میں کئی مرتبہ کلام الٰہی کی نقل کرنے کی کوشش کی گئی۔ ان کوششوں میں کچھ تو محض رسول اللہ ﷺ کا مذاق اڑانے کی نیت سے مسخرہ پن کی حد تک رہیں، لیکن کچھ سنجیدہ کوششیں ماہرین عربی کی جانب سے بھی کی گئیں (ذہن میں عہد رسالت ﷺ کے ان ماہرین عربی کو بھی رکھتے ہوئے جن کی لسانی مہارت ہر دور کے ماہرین عربی سے برتر تھی)۔ لیکن یہ تمام کوششیں بے ثمر اور باعث شرمندگی ہی ثابت ہوئیں۔

اس موقع پر ہم محض قرآن کی زبان کو بطور حوالہ نہیں استعمال کرنا چاہتے کہ قرآن کی انفرادیت اور برتری ثابت ہو، کیونکہ آپ چاہے قرآن کو ایک مرتبہ پڑھ کر غور کریں یا متعدد بار مطالعہ کرنے کے بعد، آپ ایک سخت مشکل صورت حال سے دوچار ہوں گے کہ قرآن کے کثیر الجہت معجزاتی پہلوؤں میں وہ کون سا ایک پہلو ہے جو اسے ایک مطلقاً منفرد حیثیت عطا کرتا ہے۔ قرآن کی انفرادیت کا ایک اہم وصف اس کا ناقابلِ نقل ہونا ہے اور موجودہ مطالعہ کا مقصد اور وجہ بھی قرآنی زبان کا یہی وصف۔ ناقابلِ نقل یا ناقابلِ تقلید ہونا ہے جو اپنی جگہ اس بات کی گواہی کا ایک اہم پہلو ہے کہ اس کا مصنف خود اللہ تعالیٰ بزرگ و برتر ہے اور اسی لیے اس میں مضمر اعجاز کا

تجزیہ کرنے کے لیے زبان کا مطالعہ اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے کیا جا رہا ہے کہ قرآن کے مرکزی پیغام کا اس گہرائی کے ساتھ عرفان حاصل کیا جا سکے جس کا وہ مستحق ہے۔ درحقیقت تمام خیالات ونظریات اور ایک نیا عالم جس میں قرآن اپنے قاری کو پہنچا دیتا ہے، اعلیٰ اخلاقی اقدار اور سچا ایمان۔ تزکیۂ نفس کی چھلنیاں ہیں جن سے گزار کر انسان اپنے اعمال ہی نہیں بلکہ ان کے پس پردہ اصل نیت بھی قرآن کے ذریعہ پرکھ سکتا ہے۔ یہ اتنی واضح اور فعال ہیں کہ ان کے ذریعہ ہم انسان صرف موجودہ کائنات میں ہی اپنی حقیقت اور مقام کا تعین کرنے کے قابل نہیں ہوتے بلکہ اپنے اس آخری انجام یعنی آخرت کا بھی ادراک کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں جب یہ مادی زندگی اور اس کا سراب سب فنا ہو جائیں گے۔

قرآن کے نزول سے لے کر آج تک کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان علماء نے ہر زمانہ میں قرآن کی معجزاتی زبان کے جمالیاتی پہلوؤں کو بڑی تفصیل اور خوش اسلوبی سے ایک مربوط انداز میں پیش کرنے کے ساتھ ساتھ دیگر ادبی محرکات، مغز معنی اور حیرت انگیز سائنسی آیات پر بھی تحقیق وتجزیہ پیش کیا ہے۔ بہرنوع، فاضل مصنف کے خیال میں کسی عالم نے بھی قرآنی زبان کے ایک ''پوشیدہ پہلو'' کو کما حقہ بیان نہیں کیا ہے اور اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ ہم اتنی طویل مدت سے قرآن کا مطالعہ کر رہے ہیں اور اس کی عمومیت سے اتنے مایوس ہو چکے ہیں کہ ہم نے زبان کے اس خاص ''پوشیدہ پہلو'' کی طرف بہت ہی کم توجہ دی ہے اور یہ ''پوشیدہ راز'' سادہ ترین الفاظ میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے: ''مانا کہ قرآن عربی زبان میں نازل ہوا تھا پھر بھی یہ عربی بالکل ''نئی قسم'' کی تھی جس نے اپنے اول اول سامعین کو بالکل مبہوت کر دیا۔ قرآنی عربی مروجہ عربی سے کس طرح اور کتنی مختلف تھی اس کتاب کا اصل موضوع ہے۔

قرون اولیٰ کے مسلمانوں نے جو قرآن کے اولین سامع تھے، جس طرح قرآنی الفاظ، ان کی آوازوں اور خاص لحنوں سے تاثر قبول کیا وہ اس صلاحیتِ اثر کے بالکل مطابق تھا جس سے سامعین قرآن لسانی وصوتی جمال اور شوکت الفاظ کے مداح ہو گئے تھے۔

ہم موجودہ ترقی یافتہ زمانہ کے لوگ اس خاص حیران کُن تاثر سے غالباً اس لیے محروم ہیں کہ ہمارے کان بچپن سے قرآن کی اس معجزاتی زبان، لحن اور اس کے اوصاف سے آشنا رہے

ہیں اور ہم بلوغت کی عمر تک پہنچتے پہنچتے اس میں کوئی چونکا دینے والی چیز پہچاننے کی حس ہی کھو بیٹھتے ہیں۔ حالانکہ اس زمانہ میں ہمارے آس پاس انواع واقسام کی فرنگہائے عرب وعجم (ڈکشنریز) اور قرآنی مطالعات کا ایک وسیع ذخیرہ بکھرا پڑا ہے۔ فاضل مصنف اس کتاب میں یہی کاوش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ وہ قاری کی آنکھوں پر سے اسی ''عمومیت'' اور عادت کا نقاب ہٹا کر قرآن کو ایک بالکل نئی اور تازہ کتاب کی حیثیت سے پیش کریں۔ تاکہ قاری قرآن کو ایک ایسی نئی نظر سے دیکھ سکے جو قرآن کے ''اعجاز'' کو ایک نئی زندگی عطا کرتی ہے۔

اس حقیقت کے باوجود کہ قرآن کی معجزاتی زبان کو مسلمانوں نے ہمیشہ سے اسی حیثیت میں بلاتامل، دل ودماغ کی پوری طمانیت کے ساتھ مانا اور قبول کیا ہے، پھر بھی جہاں تک فاضل مصنف کی معلومات کا تعلق ہے، قرآن کی زبان کا باضابطہ مطالعہ، علمی طریقۂ کار کے مطابق کسی نے اب تک نہیں کیا تھا جو اس ''عقیدہ'' کو ثابت بھی کرسکتا کہ ''قرآنی زبان'' واقعی اپنی جگہ ایک معجزہ ہے۔ لہٰذا، مصنف سائنسی بنیادوں پر اور قرآنی زبان بمقابلہ قبل اسلام شاعری، احادیث رسول اور قدیم وجدید ماہرین عربی کی زبان کے تقابلی مطالعہ سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ قرآن کی زبان کا ''اعجاز'' اس حقیقت میں مضمر ہے کہ یہ عربی زبان ہوتے ہوئے بھی ایک بالکل نئی قسم کی عربی ہے۔

موجودہ مطالعہ، مشاہدہ اور تحقیق کی بنیاد پر، یہ ثابت کرنے کی کوشش ہے کہ عربوں کو اس نئی قرآنی زبان سے نہ تو پہلے کبھی سابقہ پڑا تھا اور نہ ہی وہ بعد میں کبھی بھی اس کی نقل کرسکے، جبکہ نبی کریم ﷺ کی زبان اپنی سلاست اور اثر انگیزی کی اعلیٰ مثال ہوتے ہوئے بھی بہرحال ایک انسان کا کلام تھا، جس کا ایک افسوس ناک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ دشمنوں نے صحیح اور موضوع احادیث کو خلط ملط کردیا۔ قرآن کے ساتھ کوئی بھی اس طرح کی تحریف نہ پہلے کبھی کرسکا اور نہ ہی آئندہ کرسکے گا جو قرآن کے کلام الٰہی ہونے کی ایک اور شہادت ہے۔

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ. (بے شک ہم (اللہ تعالیٰ) نے ہی یہ یاددہانی (نصیحت) نازل فرمائی ہے اور ہم (اللہ تعالیٰ) ہی بلاشبہ اس کی حفاظت فرمانے والے ہیں۔ (15:9)

آئی آئی آئی ٹی لندن آفس

(اردو ترجمہ: طاہر محمود)

قرآن
عربی زبان کا ایک زبردست معجزہ

تعارف

یہ سلسلہ 1989ء میں شروع ہوا، جب آکسفورڈ مرکز برائے اسلامی علوم نے مجھ سے فرمائش کی کہ میں ایسے برطانوی طلبہ کے سامنے جو قرآن پاک کے واسطہ سے عربی زبان کا ایک بہتر فہم حاصل کرنا چاہتے ہیں، چند لیکچرز پیش کروں۔ ان طلبہ کے لیے اپنے ان لیکچرز میں، میں نے قرآن کے مطالب کو انگریزی زبان میں ترجمہ کرنے کی پوری پوری سعی کی، لیکن وقفۂ سوالات میں طلبہ کے ایسے چبھتے ہوئے، مشکل سوالات نے مجھے ورطۂ حیرت میں ڈال دیا، جو ان لسانی روایات اور مروجہ اصولوں کی حدود سے متجاوز تھے، جن سے عمومی طور پر مترجمین اور ماہرین لسانیات واقف ہوتے ہیں۔

اسی زمانہ میں، میں اور میرے ایک دوست جو برطانوی مستشرق تھے اور آکسفورڈ یونیورسٹی کے ''اورینٹل انسٹی ٹیوٹ سے وابستہ تھے، ایک کتاب کی تدوین کر رہے تھے۔ یہ کتاب اسلامی تاریخ کے ''اندلسی دور'' کی تصنیف تھی۔ ایک دن میرے دوست نے مجھ سے پوچھا، ''عربی میں کیا زیادہ صحیح ہے: مازال یا لازال؟'' کچھ بحث، مباحثہ اور ردوقدح کے بعد میرے دوست نے اصرار کیا کہ ''نہیں، لازال'' زیادہ درست ہے اور میں نے اصرار کیا کہ 'مازال' درست ہے۔ آخر میں اس نے یہ کہہ کر مجھے حیران کر دیا کہ ''اچھا تو پھر یا تو تم غلطی پر ہو یا اللہ تعالیٰ (نعوذ باللہ)، حقیقت تو یہ ہے کہ قرآن ہمیشہ 'لازال' استعمال کرتا ہے!''

ایک لمحہ کے لیے تو میں بالکل گنگ ہو کر رہ گیا۔ پھر میں نے اپنے حواس مجتمع کئے اور

اس سے پوچھا، ''اچھا تو یہ بتاؤ کہ تم فعل کان کا ترجمہ کیسے کرو گے؟ اس نے بلاتردد جواب دیا کان کا ترجمہ ''تھا'' کروں گا۔ میں نے پوچھا، ''اگر یہ بات ہے تو تم قرآن کے اس کلمہ کا ترجمہ کیا کروگے **وکان اللہ غفورا رحیما**۔ اس نے اسی اعتماد سے جواب دیا ''اور اللہ بہت ہی معاف فرمانے والا اور انتہائی رحم فرمانے والا ہے''۔ میں نے استفسار کیا ''اس ترجمہ میں فعل کان کا ترجمہ ''تھا'' کہاں ہے؟ لیکن وہ جواب نہیں دے سکا، کیونکہ اس کلمہ کا واحد ترجمہ ''ہے'' ہی ہو سکتا ہے جو عربی کے یکن یا ان کا مساوی ہے، نہ کہ مصدر کی ماضی کی شکل ''کان'' کا۔

قرآن کی اپنی ایک منفرد زبان اور لسانی استعمالات ہیں جو ہماری انسانی زندگی کی روز مرہ زبان سے مختلف ہے، چاہے ہماری عمومی زبان سے مقابلہ کیا جائے، چاہے عالمانہ، فاضلانہ گفتگو سے، کسی بھی انسان نے، حتی کہ خود رسول اللہ ﷺ نے بھی لفظ 'کان' حال کے صیغہ ''ہے'' کے معنی میں کبھی استعمال نہیں کیا۔ بہرنوع، قرآن میں کان کا یہ استعمال 190 مرتبہ ہوا ہے۔ میرے مستشرق دوست نے جو بات مازال کی بابت کہی تھی اس کی تصدیق کے لیے جب میں نے قرآن کی طرف رجوع کیا تو مجھے حیرت ہوئی کہ اس کا خیال درست نہیں تھا۔ قرآن حرفِ نفی کے طور پر ''ما'' ہمیشہ ماضی کے صیغہ کے ساتھ استعمال کرتا ہے جیسا کہ 'مازال' میں ہے اور حرف نفی 'لا' مضارع یعنی فعل حال کے ساتھ، جیسے کہ کلمہ لا یزال میں۔ چنانچہ ہمیں قرآن میں کہیں بھی لازال یا مایزال نہیں ملتا۔

بہرحال اسی تحقیق کے دوران ایک اور چیز جو حد درجہ حیران کن تھی، میرے سامنے آئی اور وہ یہ تھی کہ قرآن جہاں کہیں بھی فعل ماضی زال یا فعل مضارع یزال استعمال کرتا ہے، وہ ان افعال کے انسانی زبان میں استعمالات سے قطعی مختلف ہے۔ جب ہم کہتے ہیں ''**مازال مطر یھتل**'' تو اس کا لفظ بلفظ مطلب ہوتا کہ ''بارش گرنا بند نہیں ہوئی ہے'' اور سننے والا سمجھ جاتا ہے کہ بارش پہلے سے ہو رہی تھی اور اب بھی ہو رہی ہے۔ کلمہ مازال اس طرح اپنے معنی میں فعل ماضی اور حال دونوں سموئے ہوئے ہے، لیکن فعل مستقبل نہیں۔ یہ اس کلمہ کا عمومی طور پر تسلیم شدہ استعمال ہے۔ بہرنوع فعل ماضی کی شکل میں مازال قرآن کی صرف دو آیتوں میں استعمال ہوا ہے، جن میں یہ کسی ماضی کی چیز کا تاثر ہم تک پہنچاتا ہے جو زمانہ حال تک جاری نہیں رہی۔ قرآنی

آیات درج ذیل ہیں:

فَمَا زَالَت تِّلْکَ دَعْوَاهُمْ حَتَّى جَعَلْنَاهُمْ حَصِيْداً خَامِدِيْنَ.

اوران کی چیخ وپکار ختم نہیں ہوئی جب تک کہ ہم نے انہیں روندی ہوئی زمین (کی طرح) نہیں کردیا، بے حس وحرکت اور خاموش راکھ کی طرح (سورۃ الانبیاء 21:15)

وَلَقَدْ جَاءكُمْ يُوسُفُ مِن قَبْلُ بِالْبَيِّنَاتِ فَمَا زِلْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّمَّا جَاءكُم بِهِ حَتَّى إِذَا هَلَكَ قُلْتُمْ لَن يَبْعَثَ اللَّهُ مِن بَعْدِهِ رَسُولاً.

تحقیق یوسف علیہ السلام آئے تمہارے پاس اس سے پہلے کھلی نشانیاں لے کر، مگر تم ان سب (ہدایات) میں جو وہ لائے تھے شک کرنے سے باز نہیں آئے (مَا زِلْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّمَّا جَاءكُم بِهِ) یہاں تک کہ جب وہ وفات پا گئے تم کہنے لگے ''اب ان کے بعد کوئی نبی اللہ تعالیٰ نہیں بھیجے گا۔'' (سورۃ غافر: 40:34)

ان دونوں آیتوں میں سے پہلی آیت کا مطلب یہ ہے کہ لوگ آہ وبکا کرتے رہے حتی کہ وہ تباہ کردیئے گئے اور یہ تمام کیفیت ماضی میں وقوع پذیر ہوئی اور دوسری آیت کا مطلب بھی بیان کردیا گیا کہ یوسف علی السلام کے زمانہ کے لوگ ان کی دعوت اور پیغام کے بارے میں شکوک وشبہات ہی سے چمٹے رہے یہاں تک کہ ان کی وفات ہوگئی۔ یہ سب بھی ماضی ہی میں شروع ہوکر، ماضی ہی میں تمام ہوگیا اور زمانہ حال تک نہیں پہنچا۔

اب جہاں تک زمانۂ حال کے کلمہ لایزال کے قرآنی استعمال کا تعلق ہے، اس میں ماضی، حال اور مستقبل سب شامل ہیں، جس فعل کی طرف بھی قرآن اشارہ کررہا ہے، وہ ماضی میں بھی ہوا، موجودہ زمانہ حال میں بھی ہورہا ہے اور مستقبل میں بھی ہوتا رہے گا۔ زبان کو مروجہ طریقہ سے ہٹ کر استعمال کرنے کا مظاہرہ درج ذیل تین آیتوں میں بخوبی دیکھا جاسکتا ہے:

وَلاَ يَزَالُونَ يُقَاتِلُونَكُمْ حَتَّىَ يَرُدُّوكُمْ عَن دِيْنِكُمْ.

(تمہارے دشمن تم سے جنگ کرنا نہیں چھوڑیں گے جب تک کہ وہ، (اگر ان کے بس میں ہو)، تمہیں تمہارے دین سے پھیر دیں۔ (سورۃ بقرۃ: 2:217)

لاَ يَزَالُ بُنْيَانُهُمُ الَّذِىْ بَنَوْاْ رِيْبَةً فِيْ قُلُوبِهِمْ إِلاَّ أَن تَقَطَّعَ قُلُوبُهُمْ.

وہ عمارت (بغض وعناد کی) جوانھوں نے تعمیر کی ہے ہرگز ان کے دلوں میں بے چینی کا باعث بننے سے نہیں باز آئے گی جب تک کہ ان کے قلوب ریزہ ریزہ ہوکر بکھر نہیں جائیں گے۔ (التوبہ:9:110)

وَلَوْ شَاء رَبُّکَ لَجَعَلَ النَّاسَ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلاَ یَزَالُونَ مُخْتَلِفِیْنَ. إِلَّا مَن رَّحِمَ رَبُّکَ.

اور اگر آپ کا رب چاہتا تو سارے انسانوں کو ایک ہی امت (ایمان والے) بنا دیتا مگر (اس نے اس کے برخلاف چاہا اور اس کی مشیت سے) لوگ مختلف الخیال چلے آرہے ہیں، سوائے ان لوگوں کے جن پر آپ کے رب نے رحم فرمادیا ہے۔ (سورۃ ہود 11:118-119)

قرآن کے اسی دوسرے اور چونکا دینے والے طرزِ بیان کی دریافت نے، جس سے جدید مغربی دنیا کے علمی شعور کو بار بار سابقہ پیش آرہا تھا، مجھے یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ اپنے روزمرہ کے مطالعہ قرآن سے شناسائی نے اور ایک عادت کی طرح روزانہ تلاوت کی تکرار نے مجھے اس اثر پذیری سے تقریباً بے حس کر دیا تھا، جس کا تجربہ اور فہم رسول اللہ ﷺ کے زمانہ کے عربوں کو ہوا تھا، جن کی آنکھوں کے سامنے رسول اللہ ﷺ پر متواتر قرآنی آیات نازل ہونا شروع ہوئی تھیں۔ قرآن کے یہ اول مخاطبین قرآن کی زبان کے ''نئے پن'' سے ورطۂ حیرت میں پڑ گئے، کیونکہ اس کا طرز اور اسلوب ان تمام عربی ادبی اسالیب سے قطعی مختلف تھا جن سے وہ اب تک واقف تھے۔ یہ تحیر اور نئے پن کا جھنجھوڑ کر رکھ دینے والا صدمہ بعد میں تنقیدی سوالات میں تبدیل ہوگیا۔ ایک عام عرب سامع اپنے آپ سے سوال کرتا تھا ''یہ ہو کیا رہا ہے؟'' یہ قرآنی کلام جو کچھ بھی تھا، بہرحال انتہائی اہم تھا اور اس کے دوررس اثرات کی تشریح اس کے علاوہ کچھ اور ہو ہی نہیں سکتی تھی کہ یہ کسی ابھرتے ہوئے نئے ادیب یا شاعر کا کلام تھا جس کا طرز نادر بھی تھا اور جو ایک نئے طرز کی شروعات کی پیشین گوئی بھی کر رہا تھا۔

اس کتاب کی جلد اوّل میں، میں نے کوشش کی ہے کہ اپنے قارئین سے قرآن کے لغوی اسرار و رموز کا انتہائی آسان اور غیر محسوس انداز میں تعارف کرا سکوں۔ اس کوشش میں، میں ان تبدیلیوں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کروں گا جو قرآن نے عربی زبان کے لسانی ڈھانچہ میں پیدا

کیں اور ہر نئے عنصر پر بات کرتے وقت پہلے اس کی ماہیت اور اقسام بیان کرنے کی کوشش کروں گا۔ متن کی مثالوں کے لیے میں نے قرآن کی چند سورتوں خاص طور پر سورۃ مدثر سے مدد لی ہے جو نازل شدہ اولین سورتوں میں سے ایک ہے اور یہ سورۃ اس وقت کے مروجہ لسانی معمولات سے متصادم ہے۔ اس حصہ کے بیشتر ابواب اسی سورۃ کے ابھرتے ہوئے جدید لسانی، صرفی ونحوی اور بیانیہ پہلوؤں سے متعلق ہیں۔

کتاب کی دوسری جلد میں، میں انہی مظاہر کو قرآن کی دوسری سورتوں پر بھی منطبق کروں گا جو مظاہر اس جلد اول میں زیر بحث آئے ہیں۔ میں سب سے چھوٹی سورتوں میں سے ایک جو سب سے زیادہ تلاوت کی جاتی ہے، یعنی سورہ فاتحہ (1) سے آغاز کروں گا۔ اس کے بعد قرآن کی آخری بیس سورتیں زیر بحث آئیں گی جن میں ترتیب معکوس مدنظر رہے گی، یعنی سورۃ الناس (114) سے شروع کر کے سورۃ فلق (113)، سورۃ اخلاص سے ہوتا ہوا پیچھے سورۃ التین (95) تک جاؤں گا۔

بلاشبہ اپنی نوعیت کی ایک اولین تحقیق ہونے سے قطع نظر جس علمی مہم پر آپ میرے ساتھ روانہ ہوئے ہیں اس مہم کی طوالت کی حدود متعین نہیں کی جاسکتیں، یہ اس وجہ سے کہ ایک طویل عرصہ سے جاری ایک خاص رجحان نے جو قرآنی زبان کے ایک وصف ''ندرت'' یا انفرادیت سے اغماض وچشم پوشی پر مشتمل ہے، اس ندرت تک کسی کی رسائی کو مزید پیچیدہ کر دیا ہے۔ نتیجۃً اس تحقیق کا دائرہ کار مزید وسیع ہو گیا ہے۔ کسی ذہین وفاضل محقق کی نظروں سے یہ حقیقت اوجھل نہیں ہونا چاہیے کہ خواہ وہ کتنا ہی غیر متعصب طریقۂ کار اختیار کرے قرآن کی کوئی بھی تفسیر، لسانی تجزیہ یا قرآن کے اعجاز کا کوئی بھی انکشاف (جس کا اطلاق قرآن کے بیان، اس کی زبان یا سائنس پر ہو) دراصل ممکنات اور احتمالات کو جانچنے اور تولنے کا ایک ایسا عمل ہے جس میں انسانی غلطی کا امکان ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ لہٰذا، اس نسبت سے جو تحقیق ہم کر رہے ہیں وہ قرآن کی ندرت زبان کے حوالہ سے قرآن کی ''آفاقی صداقت'' تک رسائی کی ایک پرخلوص کوشش ہے جو انجام کار ہمیں یہ حقیقت باور کراتی ہے کہ ہم اپنی معمولی اور محدود صلاحیتوں کے بل پر ایک لامحدود، معجزاتی ''آفاقی صداقت'' تک مکمل رسائی سے عاجز ہیں۔

معجزہ یا محض ذکاوت انسانی؟

ساری زندگی میرا قرآن کی زبان کے اعجاز پر پختہ ایمان رہا ہے۔ اوائل زندگی میں تو یہ ایمان اس وجہ سے تھا کہ میں ایک مسلمان تھا اگرچہ کہ میں درحقیقت اس اعجاز کے ادراک کے لیے اپنی ذاتی کوئی عقلی دلیل پیش کرنے کے لائق نہیں تھا۔ اس زمانہ میں تحقیق کے جن ابتدائی اور ناپختہ وسائل تک میری رسائی تھی، ان کی وجہ سے میں اپنے آپ میں اس قابلیت کا فقدان محسوس کرتا تھا جو دلیل کے ساتھ اپنے خیالات کو ثابت کرنے کے لیے ضروری تھی۔ بہرحال، قرآن کی زبان میں میں نے ایک مسحور کن جمال، لامحدود قوت اظہار، روانی، موزونیت، جادوئی اثر اور اعلیٰ قسم کی انفرادیت کا مشاہدہ کیا۔ ان تمام خوبیوں کا کمال ایک طرف لیکن ایک چیز جس کا کما حقہ ادراک حاصل کرنے میں مجھے قطعی ناکامی ہوئی وہ قرآنی زبان کا ایسا اعجاز ہے جو زیادہ دل پذیر، زیادہ ناقابل حصول، زیادہ نفیس اور انسانی رسائی سے زیادہ بعید ہے۔ میں عرصۂ دراز سے اس آرزو میں غرق رہا ہوں کہ ایک دن میں جیسے ہی عربی فن خطابت میں طاق ہو جاؤں گا میں قرآن کے اس خاص ''اعجاز'' کو بھی شناخت کرنے کے قابل ہو جاؤں گا جس اعجاز کو میرے زیرِ مطالعہ رہی ہوئی بے شمار کتابوں میں سے کوئی ایک بھی سائنسی اور ناقابل تردید طریقہ پر شناخت کرانے میں کامیاب نہیں ہو سکی۔

ایسی کتابوں کے مصنفین نے بلاشبہ لفظ ''اعجاز'' کو اپنے عنوانات میں استعمال کیا تھا، اس کے باوجود ان تمام کتابوں نے جس بارے میں کلام کیا تھا وہ قرآن کی سلاست، نفاست، جمال اور اظہار خیال کی مکمل درستگی تھی۔ یہ ساری خوبیاں ہم دنیا بھر کی مختلف زبانوں میں تحریر کردہ، ادبی شہپاروں میں تھوڑے بہت فرق کے ساتھ تقریباً ہر قوم کے مصنّفین میں پاتے ہیں۔ بے شمار اعلیٰ دماغوں کی یاد آپ کے ذہن میں تازہ ہو گی جنھوں نے اپنی ادبی، دانشورانہ اور فنی تخلیقات سے ساری دنیا کو ورطہ حیرت میں ڈالے رکھا۔ پھر بھی آپ ان تخلیقات کی خوبیوں کو چاہے جس طرح کے القابات سے نوازیں، کسی ایک کو بھی ''معجزاتی'' کہنا ذرا بھی درست نہیں ہو گا۔ تب ہم قرآن کریم کو ہی اس خاص خوبی کا سزاوار ٹھہرانے پر اصرار کیوں کرتے ہیں؟

مزید برآں، قرآن میں وہ ''اعجاز'' کس جگہ پایا جاتا ہے اگر ''اعجاز'' کی تعریف ہی یہ کی جاتی ہو کہ ایک ایسا وصف جو انسانی قابلیت سے ماورا ہو؟ انسانی اعلیٰ تخلیقات کی تمام خوبیاں اگر ایک جگہ جمع کر لی جائیں تو شاید ایک ایسا مجموعہ اوصاف ہاتھ آ جائے جو ''اعجاز'' کی حد تک بہ مشکل پہنچ جائے، پھر بھی یہ تمام خوبیاں مل کر بھی اس قابل نہیں ہو سکیں گی جو نا قابل تردید سائنسی اصولوں پر مبنی ایک ایسے اعجاز کی نشان دہی کر سکیں جو ہم قرآن میں دریافت کرنے اور اسے بیان کرنے کی امید رکھتے ہیں۔

عربی زبان میں بی اے کرنے کے بعد بھی اپنی زندگی کے آئندہ دور میں یہی سوال مستقل میرے پیش نظر رہ کر جواب کا تقاضہ کرتا رہا، پھر میں نے عربی ادبیات میں ماسٹر اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں بھی حاصل کر لیں۔ ان تعلیمی فضائل کے باوجود میں قرآن کی زبان کے کسی ''اعجازی پہلو'' کو جاننے سے قاصر رہا، حالانکہ خود اپنی نظر میں کم از کم میں ایک ادبی محقق اور ناقد بن چکا تھا جسے زبان وادب کے فنون میں کماحقہٗ دسترس تھی۔ جیسے جیسے میں نے ''اعجاز قرآنی'' میں اپنے ایمان کی بنیاد کھوجنے کی کوشش شروع کی، ویسے ویسے مجھے طریقہ کار کی ایک گومگو کیفیت سے سابقہ پیش آیا۔ میں اپنے آپ سے سوال کرتا تھا کہ اپنے اندر کے مسلمان اور محقق میں مصالحت کس طرح کراؤں؟ زیادہ سادہ الفاظ میں یوں سمجھئے کہ اپنے مذہبی جذبات میں (جو اسلام اور اس کے قرآنی معجزہ کے لیے میرے خون میں شامل ہیں) اور جامد، تجریدی، سائنسی تجزیہ سے مفاہمت کیسے کرواؤں؟ سائنسی تحقیق کے نتائج آپ کے جذبات، ایمان، شخصی نظریات اور مفروضات سے متاثر نہیں ہونا چاہئیں۔ گویا انسانی ذکاوت اور آسمانی معجزہ کے درمیان جو غیر واضح فصیل ہے اسے بے لاگ تحقیق کے نتائج سے کس طرح واضح کیا جائے؟ سائنسی تحقیق کا نتیجہ تو اعداد وشمار جیسے ٹھوس ثبوتوں کا متقاضی ہوتا ہے۔ یہ نتیجہ انسانی رجحانات (جو ہر وقت بدلتے رہتے ہیں)، امکانات اور خواہشات کے تابع نہیں ہوتا۔

پھر میری علمی زندگی کا تیسرا دور آیا جس میں مجھے اسی چبھتے ہوئے اور تذبذب میں مبتلا کر دینے والے سوال سے سابقہ پیش آیا: قرآن کی زبان میں ''اعجاز'' کس مقام پر پایا جاتا ہے؟ یہ سوال اپنے سامنے رکھتے ہوئے لفظ ''اعجاز'' کو میں نے اس کے حقیقی، بنیادی مفہوم میں

استعمال کیا، تاکہ محض ذکاوت، سلاست، امتیاز، انتہائی درست یا خوبصورت ہونے کے ہم معنی نہ رہ جائیں۔ میں نے غور کرنا شروع کیا کہ کیا لفظ ''اعجاز'' ہمارے لیے اپنی حقیقی اہمیت کھو چکا ہے، امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ اس لفظ کی ابتدائی اہمیت ہمیں یاد تک نہیں ہے، نہ ہی اس کی کوئی شناخت باقی ہے، ہر وہ چیز جو ذرا زیادہ اعلیٰ، معیار میں بلند اور عام انسانی ذہنی سطح سے کافی اوپر نظر آتی ہے اسے ہم ''اعجاز'' کہنے لگتے ہیں۔

قرون اولیٰ کے مسلمان مفکرین اسی اصطلاح ''اعجاز'' سے کیا معنی مراد لیتے تھے؟

قرون اولیٰ کے مسلمانوں سمیت بعد کے زمانوں کے مفکرین نے بھی انتھک علمی مطالعات کئے جنہیں انہوں نے ''اعجاز القرآن'' کا عنوان دیا۔ یہ مطالعات تین خاص میدانوں پر محیط تھے:

1۔ جمالیاتی ذوق کے اصولوں کے مطابق قرآن کا جمالیاتی پہلو: قرآن کے اس پہلو سے کیے گئے جائزے یہ دکھانے کے لیے شروع کیے گئے کہ قرآن اپنی جمالیات کے لحاظ سے زبان اور الفاظ میں ایک امتیازی شان رکھتا ہے۔ ان محققین میں الجاحظ (255ھ / 869ء) ابوالحسن علی الرمانی (374ھ/ 984ء) محمد ابن یزید الواسطی (306ھ/ 918ء) ابوزید البلخی (323ھ/ 934ء)، ابوہلال العسکری (395ھ/ 1005ء) الخطابی (378ھ/ 988ء)، ابوبکر محمد ابن الطیب الباقلانی (404ھ/ 1013ء)، القاضی عبدالجبار الاسدآبادی (416ھ/ 1025ء)، عبدالقاہر الجرجانی (474ھ/ 1078ء)، ابن ابی الاسا (654ھ/ 1256ء)، ابن القیم الجوزیہ (751ھ/ 1350ء) اور دوسرے علماء شامل تھے۔ بہرنوع جمال ایک تقابلی مظہر ہی رہتا ہے جس پر بحث ہوسکتی ہے اور جس کا تعین کرنے کے پیمانوں میں ردوبدل اس لحاظ سے ہوتا رہتا ہے کہ کون شخص، کونسا معاشرہ اور کونسا زمانہ پیمانہ ساز ہے۔

لہٰذا، اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ اس لحاظ سے کوئی بھی مغربی، غیر مسلم ماہرِ زبان بعینہٖ وہی اصول اور طریقہ کار اپنائے جو مسلم علماء قرآن کے مطالعہ کے لیے

اپناتے ہیں تو وہ اسی نتیجہ پر پہنچے گا کہ شیکسپیئر، دانتے، روسو اور گوئٹے کے معیار کے مصنفین بھی ''دیوتا'' تھے۔

2۔ **زورِ بیان کا پہلو:** قرآن کی بیانیہ جہت سے متعلق جتنے مطالعات کیے گئے ان میں سب کے پیش نظر یہ ہدف تھا کہ یہ ثابت کیا جا سکے کہ اپنے کمال کو پہنچے ہوئے انتہائی درست طرز بیان کی وجہ سے قرآن ایک لسانی معجزہ ہے۔ ان مطالعات کے مصنفین ان غیر محسوس امتیازات سے بحث کرتے ہیں جو قرآن کی اصطلاحات، تراکیب اور تاثرات میں موجود ہیں، لیکن عام قاری کو وہ یکساں محسوس ہوتے ہیں۔ یہ ملتی جلتی اصطلاحات، تراکیب اور تاثرات جنہیں علماء وفضلاء متشابہات القرآن سے موسوم کرتے ہیں، الجاحظ نے اپنی کتاب ''البیان والتبیین'' میں پیش کی ہیں۔ ان کا حوالہ قاضی عبدالجبار نے اپنی کتاب متشابہ القرآن میں، محمد ابن عبداللہ الجسکافی (وفات 420ھ/ 1029ء) نے اپنی کتاب ''درة التنزيل وغرة التاويل'' میں، فخر الدین الرازی (وفات 606ھ/ 1209ء) نے ''اسرار التنزیل'' میں، محمود ابن حمزہ الکرمانی (وفات 505ھ/ 1111ء) نے اپنی کتاب ''البرهان في توجيه متشابه القرآن'' میں اور بعض دوسروں نے بھی اپنی کتابوں میں دیا ہے۔

3۔ **سائنسی پہلو:** عمومی عقیدہ اور تاثر کے برخلاف، قرآن کے سائنسی پہلو کی طرف قیاس آرائیاں اسلامی دَور کی اولین تصانیف میں ملنا شروع ہو گئی تھیں۔ دور اول کے مسلمان علماء نے اور بعد کے اسلامی مفکرین نے بھی، اس بنیاد پر کہ قرآن ان سماوی حقائق واجسام اور قدرتی مظاہر وعملیات کے بارے میں گفتگو کرتا ہے، جن کی دریافت قرآن نازل ہونے کے بھی بہت بعد میں ہوئی۔ قرآن کو ایک معجزہ منوانے کی کوشش کی۔ اگر وہ تصانیف اتنی غیر مربوط اور غیر سائنسی نہ ہوتیں تو یقیناً ''ناقابل اعتماد'' نہ ہوتیں۔ بدقسمتی سے جن ہم عصر علماء نے اس تخیل پر کام کیا ہے، خود اپنے آپ کو بھی اور اپنے قاریوں کو بھی، ایک مضحکہ خیز صورت حال سے دوچار کیا ہے۔ یہ لوگ اس خصوصی علم اور مہارت کو ظاہر کرنے سے قاصر رہے ہیں، جو اس اصطلاح ''اعجاز''

کو ثابت کرنے کی نیت لے کر اس مہم پر روانہ ہونے کے لیے درکار تھی، نہ ہی انہوں نے اپنا مقدمہ ایک علمی انداز میں پیش کیا، چوں کہ ان لوگوں کی تصنیفات جن متذکرہ سائنسی مظاہر سے بحث کرتی ہیں، ان کے بارے میں مغربی عالمانہ تحریروں سے کوئی دستاویز یا حوالہ جات شامل نہیں ہیں۔ دور اول کے علماء تو اس سلسلہ میں بہت حد تک قابل معافی ہیں کہ مغربی تحقیق وتصنیف کے حوالہ جات نہیں دے سکے، دوسرے یہ کہ ان کی تصانیف جدید دور کے ہم خیال علماء کے مقابلہ میں زیادہ منظّم اور مربوط تھیں۔ قدیم مسلمان مفکرین اپنے زمانہ کے سائنسی شعبہ جات اور دریافتوں سے بخوبی واقف اور ان کے ماہر تھے۔

درحقیقت ان معاملات میں ان کا کہنا حرف آخر تھا، کیونکہ اس زمانہ میں انسانی تہذیب دائیں سے بائیں طرف (یعنی عربی زبان میں) قلم بند کی جاتی رہی تھی، مسلمان بولتے تھے اور دنیا سنتی تھی۔ مسلم دنیا املا کرواتی تھی اور باقی دنیا لکھتی تھی۔ زمانہ حال میں صورت حال اس کے بالکل برعکس ہے، علمی اور سائنسی تحقیق کے مراکز، دریافتوں، جدت طرازیوں اور آخری فیصلوں کے مراکز مشرق سے مغرب کی طرف منتقل ہو چکے ہیں اور انسانی تہذیب بائیں سے دائیں (یعنی مغربی زبانوں میں) لکھی جا رہی ہے۔ اولین مسلمان علماء جنہوں نے ''سائنسی اعجاز'' پر خیال آرائی کی ان میں الجاحظ، ابن سراقہ (و415ھ/ 1023ء)، الماوردی (وفات 450ھ/ 1058ء)، الغزالی (وفات 505ھ/ 1111ء)، القاضی عیاض (وفات 544ھ/ 1149ء)، فخر الدین الرازی، ابن ابوالفضل المرسی (وفات 655ھ/ 1257ء) اور داؤد الانطا کی (وفات 1008ھ/ 1599ء) ہیں۔ ان کے بعد کے دور میں جن مسلمان مصنّفین نے اس موضوع پر خیال آرائی کی ان میں الاسکندرانی (وفات 1307ھ/ 1889ء)، عبدالرحمٰن الکواکبی (وفات 1320ھ/ 1903ء) اور طنطاوی جوھری (وفات 1359ھ/ 1940ء) شامل ہیں۔ اس موضوع پر تحریر وتصنیف کی تحریک نے بیسویں صدی میں زور پکڑا جس کے نتیجہ میں ''قرآن کا عددی اعجاز'' کے موضوع پر کتابوں کا سلسلہ اشاعت پذیر ہوا۔ اس قبیل کی اولین کتابوں میں عبدالرزاق نوفل کی ''**الاعجاز العددي في القرآن الكريم**''

ہے، جو 1970ء کے اوائل میں منظر عام پر آئی۔ اپنی کتاب میں نوفل صاحب نے ایک لمبی فہرست ''بار بار دہرائے جانے والے الفاظ'' (المثاني) کی دی ہے، جن پر قرآن کی زبان اپنی بنیاد قائم کرتی ہے۔ مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ الفاظ ''دن'' اور ''رات'' قرآن میں بالکل برابر کی تعداد میں ملتے ہیں۔ اسی طرح ''جنت اور دوزخ''، اور الفاظ ''ملائکہ وشیاطین'' بالکل برابر تعداد میں موجود ہیں۔ مصنّف نے یہاں تک باریک بینی سے مشاہدہ کیا ہے کہ مہینہ کے لیے لفظ ''شہر'' پورے بارہ مرتبہ قرآن میں ہے، جب کہ ''دن'' کے لیے عربی لفظ ''یوم'' ٹھیک 365 مرتبہ آیا ہے۔ جناب فخر الدین الرازی پہلے عالم تھے، جنہوں نے قرآنی زبان کے اسرار ورموز کے اس پہلو کی طرف متوجہ کیا اور سورۃ الزمر میں موجود ایک آیت کے حوالہ سے (39:23) اس اصطلاح ''مثاني''، یعنی بار بار دہرانے پر بحث کی۔ یہ آیت قرآن کے بارے میں کہتی ہے:

''اللہ ہی نے بہترین کلام نازل فرمایا ہے، جو ایک کتاب ہے جس کی باتیں (نظم اور معانی میں) ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں (جس کی آیتیں) بار بار دہرائی گئی ہیں، جس سے ان لوگوں کے جسموں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں.....'' [1]

جہاں تک اس کتاب کا تعلق ہے، یہ قرآن کی زبان کے صرف اس پہلو پر توجہ مرکوز کرے گی جسے میں اپنے تئیں واقعی ''معجزاتی پہلو'' سمجھتا ہوں اور وہ قرآنی زبان کی ''جدت'' ہے۔ یہ نیا پن یہاں وہاں کسی لفظ یا تاثر تک محدود نہیں ہے، بلکہ شروع سے آخر تک یہ جدت پورے قرآن کی زبان کو احاطہ میں لئے ہوئے ہے: عمودی اور افقی، لسانی طور پر بھی اور خطابت کو بھی، الفاظ کی سطح پر، آیات اور ان کے مختصر حصوں کی بناوٹ، بیانات کی سطح پر، الفاظ کا جماؤ، ان کی قافیہ بندی اور لے، تماثیل، تفسیر اور یہ سب اس قدر زور وتکرار کے ساتھ کہ اس کلام کے مثل کسی انسانی کلام کا تخلیق پا جانا تو درکنار اس طرز کے قریب پہنچنا بھی ناممکنات میں سے ہے۔

اس لسانی نئے پن اور ندرت کے باوجود قرآن نے عربی زبان کی بنیادوں کی پاسداری کی جس کے باعث جن اہل زبان سامعین نے اسے سنا، فوری طور پر اسے بخوبی سمجھ گئے۔ حقیقتاً اس کے نئے پن کے باوجود وہ نہ صرف قرآن سمجھے، بلکہ ناقابل بیان حد تک اس سے متاثر بھی ہوئے۔

رسول اللہ ﷺ کے زمانہ کے عربوں پر قرآن کی جدت وندرت کا اثر

قرآن کے نئے پن نے، جو اس کے متن اور انداز، الفاظ کے انتخابات، اظہار، قواعد، خدوخال اور زور بیان سب میں مختلف درجوں میں جلوہ افروز تھا۔ اپنے تمام سامعین کو جنہوں نے پہلی مرتبہ وحی الٰہی کو سنا ایک عجب تذبذب اور خوشگوار حیرت سے دوچار کیا۔ ایک سادہ سے، سہ لفظی قرآنی کلام کے ٹکڑے فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ پس کھلے عام اعلان کر دیجئے جس کا حکم آپ کو (اعلان کرنے کے لیے) دیا جا رہا ہے۔ (سورۃ حجر 15:94) نے ایک بدو عرب کو یہ کہنے پر مجبور کر دیا کہ ''یہ میں کیا سن رہا ہوں؟ یہ کوئی انسانی کلام ہرگز نہیں ہے!'' پھر وہ یہ کہتے ہوئے سجدہ میں گر پڑا کہ ''یہ ایسا فصیح و بلیغ کلام تھا کہ میں نے اس کے خالق کے آگے عبادت کے لیے سر نیاز خم کر دیا۔''[2]

یہ مثال ظاہر کرتی ہے کہ صورت حال میں ایسی لطیف تبدیلی اور پراسراریت رونما ہو رہی تھی جس کا ادراک کرنے سے ہمارے ترقی یافتہ، جدید ''کان'' قاصر ہیں۔ ہم عمر بن خطابؓ یا اس بدو عرب جس کا حوالہ اوپر دیا گیا ہے، یا دوسرے عربوں کے کان سے کیسے سن سکتے ہیں، جنہوں نے یہ کلام سنتے ہی اپنی ذاتی خواہشات کو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے تابع کر دیا؟ اگر ہم اپنی سماعتوں کو ان لوگوں کی سماعت سے تبدیل کر سکیں، تو شاید ہم بھی اسی معجزاتی تاثر کا ادراک کر سکیں جس سے وہ لوگ گزرے؟ شاید ہم بھی اس تجربہ سے گزر سکیں جس سے وہ گزرے اور ہم اس خاص ''معجزاتی'' چیز کو اپنی گرفت میں لے سکیں، جس کی نشاندہی سے اب تک قاصر رہے ہیں؟

میں ہمیشہ اس بات پر حیران ہوتا تھا کہ قرآن میں ایسی کیا بات تھی کہ اس نے اپنے زمانہ کے عربوں کو کھلی دعوت مقابلہ دے ڈالی؟ ایسی دعوت مقابلہ طیش آور تو تھی، لیکن اپنے معیار کی بنا پر حقیقت پسندانہ اور مناسب بھی تھی، چونکہ ان جیسے لوگوں کو جنہیں اپنی زبان دانی پر بڑا زعم تھا یہ دعوت دینا کہ وہ اس جیسی دس سورتیں ہی بنا لائیں، خاص تحقیر آمیز اور مروجہ معیارات کو متزلزل کرنے کی دعوت تھی۔ ساتھ ہی جو شخصیت یہ دعوت دے رہی تھی اس کے غیر معمولی اعتماد کا

مظہر بھی تھی۔ اس پر ہی بس نہیں، اس کے بعد بھی دو مختلف مواقع پر، دو مختلف سورتوں میں جو بہت ہی مختلف مواقع پر نازل ہوئیں (سورۃ بقرۃ 2:23 اور سورۃ یونس 10:38)، یہ دعوت دینا کہ اس کلام جیسی صرف ایک سورۃ ہی بنالاؤ، غیر معمولی سے بھی اعلیٰ درجہ کی دعوت مقابلہ تھی۔ جو شخصیت اس غیر معمولی جرأت کا اظہار کر رہی تھی، اس کے اعتماد کا کیا ٹھکانہ تھا؟ کیا ہو جاتا اگر اس وقت کے صفِ اول کے شعرا، ادیب، مقررین، زبان داں اور ذہین ترین لوگ سر جوڑ کر بیٹھ جاتے اور صرف ایک چھوٹی سی سورت جو سورۃ ضحیٰ، یا سورۃ عصر یا صرف سورۃ کوثر جتنی مختصر ہوتی'' بنا ڈالتے۔ صرف ایک سطر ہی کی تو بات تھی! کیا یہ اسی قدر دشوار کام تھا؟ کیا قرآن ان کی اپنی ہی زبان میں نہیں تھا جس کے وہ ماہر تھے؟

قرآن کی لسانی جدت میں آشکار ''اعجاز'' کی حقیقی حد

جب میں نے مذکورہ بالا سوالات کا جواب دینے کے لیے اپنے کام کا آغاز کیا تو قرآنی زبان کو اپنی لسانی تجربہ گاہ میں لایا اور اس کے عناصر ترکیبی کا باریک بینی سے مشاہدہ کرنے کی کوشش کی۔ اس وقت مجھے درست طور پر یہ اندازہ نہیں تھا کہ میں نے اپنے آپ کو کس قسم کی دعوت مقابلہ دے دی ہے۔ اس سے قبل مجھے کبھی یہ احساس نہیں ہوا تھا کہ ہر آیت، ہر کلمہ، ہر بیان کے پیچھے، بلکہ یہ کہنا بھی اکثر حالتوں میں درست ہوگا کہ ہر لفظ کے پیچھے ایک معجزہ یا ایک ''ایجاد'' ہی نہیں، ایک سے بھی زیادہ ''ایجادات'' موجود تھیں۔ میں اس اصلاح ''ایجاد'' سے بھی غیر مطمئن ہوں کہ انسانی زبان میں اس خاص وصف کے لیے جو قرآن کی زبان میں ہے، کوئی مناسب لفظ موجود ہی نہیں ہے۔ سچ ہے ''اللہ تعالیٰ بزرگ و برتر ہر مثال سے اعلیٰ اور دوئی سے مبرا ہے''[3]۔ چنانچہ میں نے عاجزی سے اپنا سر اس ارفع و اعلیٰ حکمت کے آگے خم کر دیا جو اس آسمانی شاہکار میں پوشیدہ ہے۔ اپنے کام کے دوران مجھ پر انکشاف ہوا کہ میں جب بھی قرآنی زبان کے اسرار و رموز کھوجنے کی کوشش کرتا ہوں، یہ محسوس کرتا ہوں کہ جیسے میں ایک ایسے بونے کی مانند ہوں جو کسی طویل قامت دیو کے انگوٹھے کو ناپنے کی کوشش کرے۔ قرآن کی زبان میں جو ندرت ہمیں ملتی ہے وہ اس قسم کی علمی دریافت نہیں ہے جو ہمیں اپنے زمانہ کی تصانیف میں ملتی

ہے۔اس کے برخلاف قرآن میں ہمیں حیرت ناک لسانی جدت طرازیوں کا ایک سلسلہ ملتا ہے جس میں انواع واقسام کے اوصاف اور اشکال ہیں۔ یہ ایک دوسرے سے اس طرح جڑے ہوئے ہیں کہ اگر کوئی شخص ان کی نقل کرنا بھی چاہے تو اس کا واسطہ ایک ایسی غیر مرئی دیوار یا رُکاوٹ سے پڑتا ہے جو ناقابل نقب ہے اور اس مرحلہ پر بڑے سے بڑا زبان داں بھی چوکڑی بھول جاتا ہے۔

فرض کیجئے! آپ کے پاس ایک خوبصورت باغیچہ ہے، جس میں آپ روزانہ کچھ وقت گزارتے ہیں۔اس میں کبھی یہاں ایک پھول سونگھتے ہیں تو کبھی وہاں ایک نئی کلی آپ کو متوجہ کرتی ہے، اور کبھی ایک درخت سے تو کبھی دوسرے درخت سے پھل چنتے ہیں۔اب فرض کیجئے ایک دن کوئی شخص آتا ہے اور آپ سے کہتا ہے کہ آپ روزانہ اس باغ میں آتے ہیں اور باقاعدگی سے انتہائی خوبصورت چیزوں کا مشاہدہ کرتے ہیں، اس کے باوجود ہزاروں حیران کن سربستہ اسرار یہاں ایسے بھی ہیں، جن تک آپ کی نگاہ نہیں پہنچتی۔اس کے بعد وہی شخص آپ کو ایک خاص عینک دیتا ہے جس کو لگاتے ہی آپ کی نظروں کے سامنے ایک بالکل مختلف منظر آجاتا ہے، جس سے آپ اب تک ناواقف تھے۔اب آپ کو ہر پتھر کے نیچے ایک قیمتی موتی، گلاب کی ہر دو پنکھڑیوں کے درمیان ایک نازک روپہلی پتی، ہر درخت کی چھال کے نیچے خوشبودار راس اور گرد وغبار کے دو انباروں کے درمیان کسی قیمتی دھات کے ذرات نظر آنے لگتے ہیں۔ یہ بھی فرض کر لیجئے کہ آپ پر منکشف ہوتا ہے کہ یہ سب چیزیں ہمیشہ سے آپ کے باغ میں موجود تھیں، مگر آپ کو ان کا قطعاً کوئی شعور نہیں تھا۔

اس کتاب کی تیاری کے لیے اپنے کام کا بڑا حصہ میں نے اس خاص ''عینک'' کی تلاش میں صرف کیا اور جیسے ہی مجھے وہ عینک مل گئی میں نے پختہ ارادہ کر لیا کہ میں اپنے قاری کا ہاتھ تھام کر اسے بھی یہ نیا منظر دکھاؤں۔یہی عینک پہن کر میرا قاری اپنے آپ کو اس ''بیجانر گسیت'' سے آزاد کرالے گا، جس نے میرے قاری کی اس صلاحیت کو ہی برباد کر دیا ہے، جس سے کام لے کر وہ اس زبان کے لامحدود، پراسرار معجزات اپنی آنکھوں سے دیکھ سکے جو ہمیشہ سے اس کے سامنے موجود تھے، لیکن وہ انہیں پہچاننے سے محروم تھا۔

قرآن کی جدت طرازیوں کا معجزاتی تواتر

مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ مجھے ایک تصویری معمہ دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ بظاہر اس تصویر میں اونچے اونچے پہاڑوں کا ایک سلسلہ نظر آ رہا تھا۔ اس تصویر میں ایک ایسا حیرت انگیز وصف تھا کہ محسوس ہوتا تھا کہ تصویر چاند یا مریخ کی سطح کی ہے۔ جب میں نے اس معمہ کا جواب معلوم کرنے کے لیے کاغذ الٹ کر دوسری طرف دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ تو انسانی ہاتھ کی انگلیوں پر جو لکیریں ہوتی ہیں، ان کی کئی گنا بڑی کی ہوئی تصویر ہے۔ مجھے اندازہ ہے کہ میرے قاری بھی تقریباً اسی قسم کے احساس سے دوچار ہوں گے جب وہ قرآن کی زبان کے خدوخال کو اس خاص عینک کے ذریعہ دیکھنے کی کوشش کریں گے جو یہ مطالعہ آپ کو مہیا کر رہا ہے۔ اس عینک کے سہارے میرے قاری قرآنی زبان کے تابناک مظاہر کو اپنی پوری شان کے ساتھ ملاحظہ کرنے میں آخر کار کامیاب ہو جائیں گے۔

اگر ہم ان مظاہر میں سے کسی ایک کو انفرادی طور پر لیں اور اس سے پہلے یا بعد کے مظہر کو نہ ملائیں تو شاید ہم کوئی آخری فیصلہ نہ کر سکیں کہ: ہاں یہ جدت طرازی ہے، لیکن جدت طرازی ''معجزہ'' کب سے ہو گئی؟ اور ہم یہ اعتراض کرنے میں قطعی حق بجانب ہوں گے، کیونکہ اس دعویٰ کی کوئی دلیل نہیں ہوگی کہ محض ایک دو یا چلئے تین مقامات پر بھی بکھری ہوئی جدت طرازی کی مثالوں سے قرآن کی زبان کو ''معجزہ'' قرار دے دیا جائے۔ بہرنوع جب ہم جدت طرازی کے مظاہر کی بلاغت اور تعداد کو قرآنی آیات اور سورتوں میں مستقل موجود پاتے ہیں، جب ہم دیکھتے ہیں کہ ایک ہی سانس میں یکے بعد دیگرے یہ نادر مظاہر بغیر کسی وقفہ یا تعطیل کے آئے چلے جا رہے ہیں اور ہر لفظ، ترکیب اور تاثر کلام، جدت طرازی کے عجائب اپنے میں پنہاں کیے ہوئے ہے، تو ہم قرآن کی اس لسانی اعجازیت کے قائل ہوتے چلے جاتے ہیں، جس کی نہ تو نقل کی جا سکتی ہے، نہ ہی اس میں تحریف ہو سکتی ہے۔

یہاں کوئی صاحب سوال کر سکتے ہیں: کیا اس دنیا میں کوئی ایسی چیز بھی ہے جس کی ہو بہو نقل نہیں ہو سکتی، لوگوں نے امریکی ڈالر، برطانوی پاؤنڈ، یورو، اور دوسری بے شمار غیر ملکی

کرنسیوں کی ہو بہو نقل بنانے میں مہارت دکھائی ہے۔ کچھ لوگوں نے قدیم مجسمہ جات، ادبی شہ پاروں، قدیم سکوں اور عظیم، مشہور عالم مصوروں کی تصاویر (پینٹنگز) کی نقول بناڈالی ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ کوئی شخص قرآن کی طرز پر ایک دوسورتیں یا آیات نہیں لکھ سکا؟ بہرحال، نقل کرنے کی صورت میں ایک صورت حال تو یہ ہوسکتی ہے کہ کسی چیز کی ایسی بہترین نقل تیار کی جائے کہ اول اول تو لوگ باگ یہ پہچان ہی نہ سکیں کہ یہ اصل نہیں ہے۔ بہت بعد میں جب جعلسازی لوگوں پر کھل جائے تو وہ نقل کرنے والے کو قرار واقعی سزا تو دیں لیکن دل ہی دل میں جعلساز کے فن کے قائل بھی ہو جائیں اور یک گونہ عظمت فن کے تاثرات محسوس کریں۔ دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ نقل اتنی بھونڈی ہو کہ لوگ فوراً ہی پہچان جائیں اور نقال کے حصہ میں مضحکہ، پھبتیاں، ہتک اور جہالت و بے ہنری کے الزامات ہی آئیں۔ یہ دوسری قسم کی بے توقیری والی صورت حال ہی ہر اس شخص کے حصہ میں آئی ہے جس نے آج تک کبھی بھی قرآنی زبان کی نقل کرنے کی کوشش کی ہے۔

قرآن کی نئی سریلی لسانی تعمیر کا عرب سامعین کو تذبذب میں مبتلا کر دینے والا اثر

رسول اللہ حضرت محمد ﷺ کے زمانہ کے قدیم، سادہ لوح، جدید تہذیب سے ناآشنا عرب بدوؤں کے لیے وحی قرآن کا نزول ایسا ہی تھا جیسے ایک بہت بڑی اڑن طشتری ان کی آنکھوں کے سامنے آسمان سے اتر کر آئی ہو: عجیب وغریب، انداز واطوار میں مکمل اور ہنرمندی کی اعلیٰ تخلیق مثال، دنیا بھر کے دوسرے انسانوں کی طرح، اس زمانہ کے عرب بھی نظم ونثر کی تخلیق میں کسی نئے اسلوب اظہار کو عموماً اس وقت تک قبول عام کی سند نہیں دیتے تھے جب تک کہ ان کی سماعتیں اس نئے قسم کے اظہار و بیان کی مخصوص لے، انداز اور ہیئت سے کئی نسلوں تک عادی نہ ہو چکی ہوں۔ اگر کوئی مصنف، خطیب یا شاعر اس زمانہ کی مانوس ہیئات سے روگردانی کرتا تھا تو سامعین اس کو ایک بے سری سمع خراشی سے زیادہ وقعت نہیں دیتے تھے، جب تک کہ ان کے کانوں میں کئی برس تک اس نئی طرز کی تخلیق کی تکرار نہ کی جا چکی ہو۔ اس انسیت کے بعد ہی وہ کسی نئی اسلوبی دریافت کو اپنے لسانی خزانہ کا 'معتبر' حصہ تسلیم کرنے پر تیار ہوتے تھے۔

تعجب کی بات ہے کہ انہی عربوں نے قرآنی زبان کے ذریعہ متعارف ہونے والے ان نو وارد لفظی، صرفی ونحوی اور خطیبانہ طوفانی موجوں کی یلغار کو بے سرا اور غیر نہیں سمجھا۔ حال ہی میں ظہور پذیر ہونے والے یہ لسانی مظاہر اپنے سامعین کے کانوں اور دلوں میں امتیازی دھن کے انبار اتنی قلیل مدت میں لگانے والے تھے جس کی پیشتر کوئی مثال نہیں ملتی۔ امید کے برخلاف پیغمبر اسلام ﷺ کے زمانہ کے عربوں کو جس چیز نے قرآن کی طرف پہلے ہی تعارف میں مائل کیا وہ قرآنی زبان کا یہی آہنگ اور موسیقیت تھی جو اس کی تلاوت کی طرز کے ساتھ ساتھ ان جذبات میں بھی تھے جو قرآن کے مطالب اور منظر نامے ان تک پہنچا رہے تھے۔ اپنے نئے پن کے باوجود، عربوں کے لیے یہ نیا آہنگ اور صوتی دھڑکنوں کے تاثرات نہ صرف قابل قبول تھے، بلکہ بڑی گرم جوشی سے نوازے گئے، حالانکہ یہ اس زمانہ کے عظیم الشان مشرک فصحا اور ادباء کو سخت شش وپنج میں مبتلا کر دینے والی دھن اور لے تھی، مشرکین عرب کا یہی مؤخر الذکر گروہ تھا جس نے اس کلام کو وحی الٰہی نہ ماننے کے باوجود اس کی تعریف میں سب سے اونچی آواز بلند کی۔ اسلام کو ماننے سے انکار کر دینے کے باوجود اس زمانہ کے ایک سرکردہ مشرک ولید بن مغیرہ نے قرآن کی درج ذیل انداز میں تعریف وتوصیف کی:

خدا کی قسم، تم سب لوگوں میں شاعری کے اسرار ورموز کا مجھ سے بہتر علم رکھنے والا یا اچھے اور برے شعر میں تمیز کر لینے والا کوئی اور نہیں ہے۔ خود جنات تک کی شاعری کا علم مجھ سے زیادہ کسی کو نہیں ہے! اس کے باوجود میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ جو کلام یہ شخص (نبی اکرم ﷺ) سنا رہا ہے، اس کی کسی انسانی یا جناتی شاعری سے کوئی مماثلت نہیں ہے۔ اس کے الفاظ میں ایک شیرینی، ایک حسن اور ایک خاص شان ہے۔ (ایک اونچے درخت کی مانند) اس کی بلندی پر پھل لگے ہیں اور اس کی جڑیں خوب گہرائی میں پیوست ہیں۔ اس کے الفاظ اپنے اردگرد کے تمام الفاظ سے ارفع واعلیٰ ہیں اور کوئی بھی دوسرے الفاظ اس کے الفاظ سے بلند تر ہرگز نہیں ہو سکتے۔[4]

مجھے عہد ماضی میں پہنچا دینے والی مشین

میں حیران ہو کر بار بار اپنے آپ سے سوال کرتا تھا کہ کیا کوئی ایسی مشین ہے جو مجھے

چودہ سو سال پیچھے، ساتویں صدی عیسوی میں لے جائے اور میں قرآن کو براہ راست ان صحرائی بدوؤں کے کان سے سن سکوں جو پہلے پہل اس کلام سے آشنا ہو رہے تھے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ میں اپنی برسوں پرانی قرآنی یادداشت ہی نہیں، پوری اسلامی یادداشت کو ذہن سے کھرچ کر پھینک دوں اور زمانۂ قبل اسلام کا وہ عرب بن جاؤں جو نزول قرآن کے دور میں جی رہا تھا؟ اگر ایسا ہو سکے تو میں قرآن کو قدم بہ قدم، آیت بہ آیت اپنے ایسے ''نئے'' اور قرآن سے نامانوس، کانوں سے سنوں گا جو کان قرآن کی متواتر سماعت سے گزشتہ برسوں میں اس قدر عادی ہو چکے ہیں کہ اب وہی انسیت میرے لیے قرآن کی ذکاوت، جدت اور انفرادیت کو محسوس کرنے کی راہ میں حائل ہے۔ ساتویں صدی عیسوی کے ایک مسلمان کے لیے وحی کے الفاظ تازہ تازہ بالکل پہلی مرتبہ وصول کرنا اور وہ بھی براہ راست اللہ تعالیٰ کی طرف سے، کیسا حیرت انگیز تجربہ رہا ہوگا! اس زمانہ کے لوگوں کے لیے ان کی روزمرہ زندگی میں پیش آنے والے مسائل کا جواب جب فی الفور ان کی جیتی جاگتی آنکھوں کے سامنے اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کا پرتو لئے ہوئے اترتا ہوگا تو کتنا سنسنی خیز مرحلہ ہوتا ہوگا: ایسے روزمرہ اعلانات وحی میں کیے جاتے تھے جو کسی کو تو بَری عطا فرماتے تھے اور کسی کو ملزم ٹھہراتے تھے، انہی کے درمیان رہنے والے کچھ لوگوں کے لیے عذاب کی دھمکی اور کچھ کے لیے انعام کا وعدہ لئے ہوئے ہوتے تھے۔ اس وقت ان لوگوں کی کیا کیفیت ہوتی ہوگی جب روزانہ، بلکہ کبھی کبھی تو ایک ہی دن میں گھنٹہ گھنٹہ کے وقفہ سے کئی بار وحی الٰہی انہیں سننے کو ملتی تھی اور انہیں اتنی وسیع وعریض دنیاؤں کی سیر کراتی تھی، جن کا احاطہ کرنا ان کی اس وقت کی محدود ذہنی صلاحیتوں کے لیے کافی حد تک غیر ممکن تھا۔

چلیے! آپ بھی میرے ساتھ آیئے، میرے ساتھ! کوشش کیجئے کہ ساتویں صدی عیسوی کے ایک عرب نے جب مندرجہ ذیل آیات پہلی مرتبہ سنی ہوں گی تو اس کے ذہن پر کیسا زبردست اثر مرتب ہوا ہوگا:

اور اللہ تعالیٰ کی ذات والا شان کا کوئی درست علم ان کو ہرگز نہیں ہے (جو لوگ اس کے علاوہ دوسروں کو پوجتے ہیں) یہاں تک کہ قیامت کے دن پوری دنیا اس کی ایک مٹھی میں سمائی ہوئی ہوگی اور تمام آسمان اس کی دائیں کلائی کے گرد لپٹے ہوئے ہوں گے: وہ اپنی شان میں اعلیٰ

وارفع ہے، اوران سب چیزوں سے جن میں وہ اس ذات پاک سے شرکت کا دعویٰ کرتے ہیں، اس کی قدرت بے انتہا بلند ہے! اور (اس دن) حساب کتاب کا صور پھونک دیا جائے گا، اور تمام (مخلوقات) جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں، بے جان ہوکر پڑیں گی سوائے ان کے جنہیں اللہ تعالیٰ ہی (نہ چاہے) اوراس کے بعد ایک اور صور پھونکا جائے گا۔ اور لوگ عدالت کے تخت کے سامنے کھڑے ہوئے حقیقت مطلق کا نظارہ کررہے ہوں گے! اور زمین اپنے رب کے نور سے جگمگا رہی ہوگی، اور ہر ایک کا نامۂ اعمال کھول دیا جائے گا اور تمام انبیائے کرام (گواہی کے لیے) بلائے جائیں گے اور دوسرے (تمام) گواہان بھی: اور سب کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا جائے گا اور کسی کے ساتھ کوئی (ظلم) ناانصافی نہیں کی جائے گی۔ (سورۃ زمر 39: 67-69)

ان آیات کے نزول کو چودہ سو سال گزر جانے کے بعد اب اس وقت آپ ان کے باقی تمام اثرات سے بے بہرہ رہ کر کرۂ ارض کو لرزا دینے والے صرف اس پیغام کی طاقت کو محسوس کر سکتے ہیں جو یہ آیات آپ تک پہنچا رہی ہیں، ایک ایسا پیغام جس نے ساتویں صدی عیسوی کے عربوں اور غالباً غیر عربوں، کے تخیلات وتصورات کی تمام حدوں کو بے انتہا وسیع کر دیا ہوگا۔ یہ پیغام کتنا زور آور اور پُر اثر رہا ہوگا جب یہ نزول کے وقت ایک نئے وجیہ وشکیل لباس میں ہو اور جو ایسی نئی لسانی صورتوں سے مزین ہو جن سے اس زمانہ کا کوئی عرب واقف نہ رہا ہو؟ کیا طرز بیان کی اس بے مثال قوت سے ان کے دماغ نہیں چکرا گئے ہوں گے؟ کیا ہم ان تابناک لمحوں کا تصور کر سکتے ہیں جنہوں نے اولین مسلمانوں کے دل ودماغ میں ایسی قوت، طاقت، پختہ یقین، اعتماد اور حوصلہ پیدا کیا جس کے بل پر انھوں نے ایک ایسی تہذیب کی بنیاد ڈالی جس نے تاریخ کے دھارے کا رخ موڑ دیا؟

قبل اسلام شاعری اور نبی اکرم ﷺ کی احادیث، ان قابل اعتماد معلومات کا منبع ہیں جن کی بنیاد پر ہم اس زبان کو ہو بہو دیکھ سکتے ہیں جو نزول قرآن کے وقت رائج تھی۔ اسی لیے ان تابناک لمحوں کو کھوجنے کے لیے جن کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے، میں نے طے کیا کہ اپنے ذہن کے پردے پر سے قرآن کی سابقہ سب یادیں حذف کردوں اور ان کی جگہ پہلے تو زمانۂ اسلام کے قبل کی شاعری کی یادیں اور پھر احادیث نبویؐ کی یادوں کو بھر دوں۔

تین اقسام کا ذخیرۂ الفاظ:

قرآنی، زمانہ قبل اسلام کا، اور نبویؐ الفاظ کا ذخیرہ

جب میں نے قرآن پاک کے اسلوب، قبل اسلام شاعری کے اسلوب اور احادیث نبویؐ کے اسلوب میں فرق معلوم کرنے کی کوشش شروع کی تو میں نے شاعری پر بطور خاص اپنی توجہ مرکوز کی۔ جدید برقیاتی انسائیکلوپیڈیاز (خزائن معلومات) جن تک آج ہمیں رسائی حاصل ہے، ان میں تقریباً بیس ہزار اشعار موجود ہیں جو قبل اسلام شاعری سے متعلق ہیں۔ اشعار کی یہ تعداد، قرآنی آیات کی تعداد کے تقریباً برابر یا تھوڑی سی زیادہ ہے۔ اگرچہ کہ ہمیں یہ بھی علم ہے کہ جو قبل اسلام شاعری حوادث زمانہ کی وجہ سے ضائع ہوگئی، وہ اس مقدار سے بھی زیادہ ہی رہی ہوگی جو ہم تک پہنچی ہے۔[5]

زمانہ قبل اسلام کی شاعری میں ایک خاص لسانی وصف ہے جو نبی اکرم ﷺ کی زبان سے الگ شناخت کیا جا سکتا ہے۔ حالاں کہ حضور پاک ﷺ زمانہ قبل اسلام کے بہترین دور میں پیدا ہوئے اور اپنی زندگی بسر کی۔ اسی طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا ایک مخصوص لسانی انداز اور طرز تھا جو قرآن کی زبان سے بالکل الگ پہچانا جا سکتا تھا۔ مزید برآں، یہ تینوں زبانیں کہیں بھی ایک دوسرے سے ذرہ بھر بھی مشابہ نہیں تھیں۔ یہ حقائق خود اس بات کی صاف شہادت دیتے ہیں کہ تینوں زبانوں کے جو متن ہم تک صدیوں کا سفر کر کے پہنچے ہیں وہ اپنی اپنی طرز کے خالص ہونے میں کس قدر قابل اعتماد ہیں اور امتداد زمانہ نے انہیں خلط ملط نہیں کر دیا ہے۔ اس کے برخلاف جب کوئی شخص زمانہ قبل اسلام کے شعرا کا مطالعہ کرتا ہے تو اس کے لیے یہ شاعری ایک ایسا آمیزہ معلوم ہوتی ہے جس میں سے طرز بیان اور لسانی ہیولہ کی بنیاد پر ایک شاعر کے کلام کو دوسرے سے ممیّز کرنا، ناممکنات میں سے ہے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ یہ شعرا اپنی قوت بیان یا ضعفِ بیان، طرز کے خالص ہونے، نزاکت، سادگی، تیکھے پن، اور اسی طرح کی دوسری ادبی صفات میں انفرادیت کے حامل ہیں، کسی نقاد کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ کسی کلام کے نمونہ کو سامنے رکھ کر وہ سو فیصد وثوق سے یہ دعویٰ کر سکے کہ یہ نظم فلاں شاعر کی تخلیق ہے، جب کہ قرآن کا

ایک عام قاری بھی جو محقق یا نقاد نہ بھی ہو، پورے یقین اور اعتماد سے کہہ سکتا ہے کہ فلاں جملہ یا آیتوں کا مجموعہ یا متن قرآن شریف کا ہے یا قرآن کریم کا نہیں ہے۔

اس حقیقت کے باوجود کہ احادیث نبوی ﷺ کی زبان قرآن کی زبان سے (خواہ کتنی ہی معمولی درجے کی ہوئی ہو) متاثر ضرور ہوئی ہوگی۔ پورا ذخیرۂ احادیث کھنگال ڈالئے، ان احادیث کی تعداد پورے ذخیرہ کا ایک فیصد بھی نہیں بنے گی جن میں قرآنی زبان کا کچھ ہلکا سا اثر بھی نظر آتا ہو۔ نہ ہی یہ اثر احادیث کی زبان کی ادبیت کے بنیادی تشخص میں تبدیلی کا باعث بنتا ہے۔ لہٰذا، اس موجودہ مطالعہ کے سفر میں، میں نے ان ہمہ گیر اور انتہائی شدید نوعیت کے لسانی امتیازات کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے جو حدیث و قرآن کے طرزِ بیان اور اسلوب میں ہوں۔ یہ کام میں نے اس امید پر کیا ہے کہ میں ان مستشرقین اور مشکلین کی تسلی کے لیے دونوں زبانوں کے ادبی معیارات کے فرق پر روشنی ڈال سکوں اور الزام تراشی کرنے والوں کے اس دعویٰ کی نفی کر سکوں کہ قرآن کوئی الہامی کتاب نہیں ہے اور حضرت محمد رسول اللہ ﷺ یا ان کے صحابہ کرام نے اسے گھڑ لیا ہے۔

نیا اسلوبی انقلاب

نبی اکرم کے زمانہ کے لوگوں نے قرآنی زبان کا کس طرح استقبال کیا، جبکہ اس میں ان محاورات، مکالمات اور لسانی ساختوں کا وجود ہی نہیں تھا، جن سے وہ اب تک مانوس تھے؟ مختصر ترین الفاظ میں یوں کہہ لیجئے کہ وہ گنگ ہو کر رہ گئے۔ درحقیقت اس نئی زبان نے ان کو ایک ایسے شدید ذہنی صدمہ سے دوچار کیا جس کا اثر آہستہ آہستہ اس وقت زائل ہونا شروع ہوا جب کچھ وقت گزرا اور اس نئی قسم کی زبان سے ان کی انسیت استوار ہوگئی۔

جس لسانی تبدیلی کی میں بات کر رہا ہوں وہ قرآن کے ذخیرۂ الفاظ تک ہی محدود نہیں تھی۔ اس بے حد و حساب تبدیلی میں جداگانہ، نئے نئے الفاظ کا اضافہ ہی نہیں بلکہ ان نئے الفاظ کا آپس میں تعلق، مختلف آیات میں ان کا وقوع، مطلب و معنی، حوالہ، ان کا استعمال اور وہ نئے لسانی، نحوی (گرامر سے متعلق) و تصوراتی عناصر اور روایات جن کا اس زبان پر غلبہ بھی تھا اور جو

اس عجیب زبان میں گہرائی تک نفوذ کر گئے تھے، سب شامل تھے۔ اسی طرح اس لسانی تغیر نے زبان کی ان اکائیوں کا بھی احاطہ کرلیا جو ان علیحدہ علیحدہ الفاظ سے بھی اور ان کے باہمی تعلق اور نئی روایات سے بھی وجود میں آئے۔ جب ہم قرآن کی ہر سورت کا انفرادی طور پر جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ سورۃ میں جتنی مرتبہ نئے لسانی مظاہر ظہور پذیر ہوئے ہیں وہ اس سورۃ میں موجود کل الفاظ کی تعداد سے بھی متجاوز ہیں۔ (الفاتحہ'' (1) جیسی مختصر سورۃ میں جس میں کل 29 الفاظ ہیں، کم از کم 58 جگہ اس قسم کی ''نئی پیش رفت'' نظر آتی ہے۔ سورۃ ''الناس'' (114) میں جو 20 الفاظ پر مشتمل ہے، کم سے کم 33 نئے مظاہر ہمیں ملتے ہیں، سورۃ الفلق (113) میں 38 نئے مظاہر اور سورہ اخلاص (112) میں جس میں 15 الفاظ ہیں، ہمیں 22 نئے لسانی مظاہر ملتے ہیں۔ اسی طرح دوسری تمام ''سورتوں'' میں بھی یہی طرز نظر آتا ہے۔ یہ حیرت انگیز پہلو ذہن میں رکھتے ہوئے ہم اس غیر متوقع ''اثر'' کی شدت کا اندازہ کر سکتے ہیں جو قرآن نے اپنے بے مثال لسانی کردار سے ساتویں صدی عیسوی کے عربوں کے قلب و ذہن پر ڈالا ہوگا۔

یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ قرآن اپنے ساتھ کوئی بالکل نئی زبان لے کر نہیں آیا تھا، جو اس زبان سے مختلف ہو جو اس وقت جزیرہ نمائے عرب میں موجود تھی اور اسی حقیقت میں قرآن کا اعجاز ہے۔ عربی زبان میں ہی نازل ہوا اور اسی زبان کی بنیادوں پر قرآنی زبان کی عمارت ایستادہ ہے۔ پھر بھی قرآنی زبان کی یکتائی اس ایک خاص طریقہ میں متمکن ہے جس میں یہ اس وقت کی مروجہ عربی زبان سے اس کی اصطلاحات، ساخت، محاورات، کلیات، تمثیلات اور الفاظ کے اندرونی تعلق کی تمام حدود سے متجاوز تھی۔ قرآن کا اعجاز اس انداز میں پوشیدہ ہے جس سے کام لے کر اس نے عربی زبان کے مروجہ اصولوں کو منہدم کیے بغیر ان کو نہ صرف سنوارا بلکہ ان میں نئی راہیں پیدا کیں، تاکہ ''یہ اور سجے، سنورے اور پروان چڑھے اور آخر کار اس کو ایسی جہتوں اور بلندیوں سے آشنا کرے جن کا خود عربوں نے اس مادری زبان کے بارے میں کبھی تصور تک نہ کیا ہو۔

قرآن کا اعجاز یہ بھی نہیں ہے کہ اس نے ایک بالکل نئی نویلی زبان کی بنیاد ڈالی ہو جو پہلے کبھی موجود ہی نہیں تھی۔ اگر ایسا ہوا ہوتا تو وہ زبان اور اس زبان میں آیا ہوا پیغام، دونوں ہی

تمام انسانوں سے بالکل الگ تھلگ ہو جاتے، چاہے انسانوں کی زبان کچھ بھی رہی ہوتی۔ قرآن کا اعجاز یہی ہے کہ اس نے اس وقت کی مروجہ زبان کی بنیاد پر ایک نئی زبان تخلیق کی جو آسمانی ادب کی ان بلندیوں پر پہنچی جن تک پرانی زبان کبھی بھی نہیں پہنچی تھی۔ اس مطالعہ کے سلسلہ میں میرے لیکچرز کے دوران سامعین اکثر و بیشتر میری اس اصطلاح، نئی زبان، پر اعتراض کیا کرتے تھے جو میں قرآنی زبان کے لیے استعمال کرتا ہوں۔ یہ اس لیے کہ اس اصطلاح سے سامعین تک ایک غلط تاثر جا سکتا ہے کہ میں قرآنی زبان کو عربی کے بجائے کسی اور زبان کا قرار دے رہا ہوں اور انھوں نے مجھے مشورہ دیا کہ میں اس کے بجائے کوئی دوسری اصطلاح استعمال کروں۔ پھر بھی میں یہی کہتا کہ قرآن کا اعجاز یہی تخصص ہے: ایک طرف تو یہ خالص عربی زبان ہے اور دوسری طرف ایک نئی زبان۔ یہ بات بظاہر بالکل ناقابل فہم نظر آتی ہے۔ بہرنوع، معجزہ کی فہم اور سمجھ کیا اسی بات میں مضمر نہیں ہے کہ وہ عام فہم سے بالاتر ہوتا ہے، جو معجزہ عام فہم کے دائرہ میں آجائے وہ معجزہ نہیں رہتا۔

سورتوں کا قرآنی تشخص

اسی تحقیق کے دوران ہمارے مشاہدہ میں آیا کہ قرآن میں فعل 'کانَ' جس کا عام طور پر ترجمہ ''تھا'' ہوتا ہے، وہ ''ہے'' (فعل حال) کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ فعل 'کـانَ' کا یہ نیا استعمال قرآن میں کم از کم 190 مرتبہ ہوا ہے۔ اسی پر بس نہیں، فعل 'کـانَ' کو قرآن کے اس نئے معنی میں اس وقت سے لے کر آج تک عربی نثر و نظم کے کسی بھی ٹکڑے میں استعمال کرنے کی ایک بھی مثال نہیں ملتی۔ حدیث نبوی ﷺ تک میں یہی صورت حال ہے۔ بہرنوع، قرآن کی بہت سی سورتوں میں 'کـانَ' کے استعمال کی یہ فراوانی اور بھی تعجب خیز ہے۔ یہ تو قطعی قدرتی امر ہے کہ سورۃ اخلاص جیسی مختصر سورۃ (112) میں بھی 190 میں سے ایک مرتبہ فعل 'کـــانَ' استعمال ہوا ہے۔[6] پھر ہماری توقعات کے برعکس، اگر شماریات کی زبان میں بات کی جائے، ہم دیکھتے ہیں کہ ایک طویل سورۃ ''البقرۃ'' (2) جو پورے قرآن کا 1/12 حصہ ہے، وہ سورۃ فعل 'کانَ' کے ''ہے'' کے معنی میں استعمال سے بالکل مبرا ہے۔

اچھا تو پھر ان سورتوں کا کیا معاملہ ہے جو "بقرۃ" سے تھوڑی سی ہی کم طویل ہیں، جیسے سورۃ آل عمران (3)، سورۃ المائدہ (5)، سورۃ الانعام (6)، سورۃ الاعراف (7)، سورۃ الانفال (8) اور سورۃ التوبہ (9)؟ ان میں سے کسی میں بھی، ایک مرتبہ بھی نہیں۔ یہی صورت حال سولہویں سورۃ ''النحل'' تک رہتی ہے۔ یعنی قرآن کے اول نصف تک فعل 'کـــــانَ' کا نیا استعمال ''ہے'' کے معنی میں ہمیں نہیں ملتا، سوائے سورۃ النساء (4) کے جس میں طویل خاموشی کا یہ سلسلہ منقطع ہوتا ہے اور 'النساء' میں 'کانَ' اپنے نئے معنی میں 53 مرتبہ دہرایا جاتا ہے۔ پھر سورۃ الاسراء (17) تک غائب ہو جاتا ہے اور اس سورۃ میں 27 مرتبہ کی قابل ذکر تعداد میں واقع ہوتا ہے۔ اس کے بعد پھر سات سورتوں تک نہیں ملتا یہاں تک کہ سورۃ الفرقان (25) میں پھر وارد ہوتا ہے اور 11 مرتبہ دوہرایا جاتا ہے، جس کے بعد پھر سات سورتوں تک غائب ہو جاتا ہے جب کہ سورۃ احزاب (33) میں 26 مرتبہ ملتا ہے۔ اس کے بعد آگے کی سورتوں میں تواتر کے ساتھ نظر آتا ہے۔

یہ صورت حال ہمارے اس دعویٰ کی مؤید نظر آتی ہے کہ قرآن کی ہر سورت کی اپنی نا قابل عبور حفاظتی دیوار ہے، اور ایک مخصوص لسانی 'مہر' ہے جو اسے دوسری سورتوں کی آیتوں سے خلط ملط ہونے یا ان میں گم ہونے سے محفوظ رکھتی ہے۔

اسی صورتِ حال کا ایک اہم پہلو جو زیادہ حاوی بھی ہے، یہ ہے کہ اس کی وجہ سے ہر سورت کی قرآن مجید میں اپنی موجودہ جگہ کا فیصلہ کن تعین، دوسری سورتوں سے اس کے تعلق کی بنا پر ہو جاتا ہے۔ اس ترتیب کی بنا پر قرآن میں کسی بھی انسانی تحریف کا امکان باقی نہیں رہتا جو سورتوں کی اس ترتیب کو بدلنے کے لیے کی جا سکے۔ سورتوں کی آسمانی ترتیب کا یہ مظہر جو عہد نبوی سے اسی طرح قائم و دائم ہے، ان مستشرقین کے ناانصافی اور تعصب پر مبنی اس دعویٰ کا مدلل جواب ہے کہ سورتوں کی ترتیب غیر منظّم ہے، جس کی وجہ سے یہ الہامی 'آسمانی کلام' نہیں ہو سکتا۔

ہر سورۃ پر لگی ہوئی لسانی مہر ایک ایسا معرکۃ الآراء وصف ہے جو قرآن کی معجزاتی شناخت اور تشخص کا ایک لازمی حصہ ہے، جیسا کہ آگے چل کر سورتوں کے تفصیلی مطالعہ سے واضح ہو گا کہ ہر سورت میں استعمال ہونے والی مخصوص اصطلاحات کسی اور سورۃ میں استعمال نہیں

ہوئیں اور اس کے ساتھ ہی نئے لسانی تعلق، انداز تحریر اور آیتوں کی ساخت ہر سورت کا اپنا ایک خاصہ ہے جو اس کی الگ پہچان بناتا ہے۔ علاوہ ازیں ہر سورت کی اپنی ایک لے اور نغمگی ہے جو اس سورۃ میں نفوذ کی ہوئی ہے اور یہ وصف بھی ہر سورت کو دوسری سورتوں سے صاف صاف ممیّز کرتا ہے۔

کیا مختلف سورتوں کے خواص ایک دوسرے پر سایہ فگن ہیں؟

بعض سورتوں، خاص طور پر مختصر سورتوں کو حفظ کرتے وقت ہمیں بعض مرتبہ یہ احساس ہوتا ہے کہ ہم ایک سورت سے دوسری سورۃ کی طرف بڑھ جاتے ہیں، چاہے یہ غلطی ذارا سے لمحہ کے لیے ہی کیوں نہ ہو۔ یہ غلطی اس وجہ سے ہوتی ہے کہ دوسری سورت میں بھی تقریباً وہی لے، وہی ہم قافیہ الفاظ ہوتے ہیں جو پہلی میں ہیں۔ ایسے اتفاقات یہ سورتیں حفظ کرتے وقت ہو سکتے ہیں جیسے سورۃ المرسلات (77) اور سورۃ النازعات (79)، سورۃ التکویر (81) اور سورۃ الانشقاق (84)، سورۃ الاعلیٰ (87) اور سورۃ اللیل (92)۔ اس قسم کی اتفاقی کیفیت جو ایک سورۃ سے دوسری سورۃ کی طرف ہو جاتی ہے ہمیں سوچنے پر مجبور کرتی ہے کہ کیا دو ملتی جلتی سورتوں میں خواص اتنے مماثل ہیں کہ دونوں سورتوں کی حفاظتی فصلیں ایک دوسرے میں مدغم ہو گئی ہیں اور ہمارا پہلا دعویٰ کہ ہر سورۃ کا اپنا ایک خاص لسانی تشخص ہے جس سے وہ پہچانی جاتی ہے، بے بنیاد ثابت ہوا ہے؟

سورۃ الاعلیٰ (87) اور سورۃ اللیل (92)

ملتی جلتی سورتوں کا بَسُرعت کیا ہوا مقابلہ ہی قرآن کی مماثل سورتوں کے لسانی خواص کو جو ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں، ذرا میں ظاہر کر دیتے ہیں، یہاں تک کہ ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ ان میں کوئی ایک کلمہ بھی بہ مشکل ہی مشترک ہوگا۔ مثال کے طور پر سورۃ اعلیٰ (87) اور سورۃ اللیل (92) ہی کو لے لیجئے اور ان کی لسانی ساخت اور اندازِ بیان کا تجزیہ کیجئے۔ اس تقابل سے یہ بات بالکل صاف ہو جائے گی کہ اپنی ملتی جلتی ہم لحن سطروں کے باوجود ان سورتوں کی لسانی شخصیت ایک دوسرے سے کس قدر مختلف ہے۔

سورۃ الاعلیٰ میں 72 اور سورۃ اللیل میں 71 الفاظ ہیں۔ اس حقیقت کے باوجود کہ دونوں سورتیں ہم قافیہ ہیں، جن میں ہر آیت 'الف' پر ختم ہوتی ہے، آیت کا آخری لفظ ''فعالیٰ'' کے نمونے پر ہے اور چند الفاظ یقیناً مشترک ہیں (خلقیٰ، اشقیٰ، یصلیٰ، الآخرۃ، رَبّیٰ اور الاعلیٰ)، یہ مماثلت بس یہیں تک محدود ہے۔ ان مشابہ اوصاف کو مانتے ہوئے مزید تجزیہ کریں تو ہم دیکھتے ہیں کہ ان دو میں سے ہر ایک سورت کی اپنی امتیازی شان اور بالکل جداگانہ انداز بیان، محاورات اور ساخت ہے۔ اس سے بھی زیادہ خاص وصف یہ ہے کہ اوپر بیان کی ہوئی تینوں خصوصیات ہر سورت کو معجزاتی حد تک ایک انفرادی حیثیت دیتے ہوئے موجود ہیں۔

سورۃ الاعلیٰ کا بڑا حصہ جن 26 بندشوں اور تاثرات سے مل کر بنا ہے، ہمیں قرآن کی دوسری سورتوں میں ان میں سے صرف چار کلمے دہرائے ہوئے ملتے ہیں۔ یہ کلمے 'خلق فسوی، الا ماشاء اللہ، فذکر اور ولا یحییٰ ہیں، جب کہ باقی 22 جوان تراکیب اور تاثرات کا 80 فیصد ہیں صرف اسی سورت الاعلیٰ سے مخصوص ہیں۔

سورۃ اللیل جس میں اس طرح کی 25 تراکیب اور تاثرات ہیں، ان میں سے صرف تین ایسے ہیں جو دوسری سورتوں میں بھی مشترک ہیں جیسے فأنذرتکم، کذب وتولّی، اور الا ابتغاء، باقی 22 تراکیب اور تاثرات جو کل کا 88 فیصد ہیں، کسی اور سورۃ میں، بہ شمول سورۃ الاعلیٰ کے، نہیں ملتے۔

قرآن کا منفرد وصف

نزول قرآن کا عمل جیسے ہی شروع ہوا، ہر اس عرب نے جس نے قرآن سنا، جبلی طور پر فوراً ہی محسوس کر لیا کہ اس نئے کلام میں ہر چیز ہی جدید اور منفرد ہے۔ اس کلام کی خوبیاں اس کے نام ''قرآن'' ہی سے مترشح ہیں۔ یہ عنوان اسلام آنے سے قبل کسی عرب نے استعمال نہیں کیا تھا اور یہ اچھوتا عنوان ہی اس کتاب کے مندرجات کی انفرادیت کی طرف ایک واضح اشارہ تھا۔ یہی جدت اور انفرادیت اس کتاب کے پہلے باب ''الفاتحہ'' کے عنوان سے بھی جھلکتی تھی، جو صرف قرآن کے ساتھ مخصوص تھی۔ اسی طرح جہاں تک لفظ 'سورۃ' کا تعلق ہے، جو قرآن کے مختلف

حصوں یا 'ابواب' کے حوالہ کے لیے استعمال ہو رہا تھا، اس کا ماخذ لفظ 'سُور' تھا، جس کے لغوی معنی 'شہر پناہ' یا 'فصیل' ہیں۔ اس طرح لفظ ''سورۃ'' کے لغوی معنی ہی گویا ایک آسمانی اشارہ تھا کہ یہ کلام الٰہی ایسی مضبوط فصیل سے محفوظ کیا گیا ہے جو ہر طرح کی نقب زنی سے حفاظت میں رہے گا۔ اس فصیل کی موجودگی میں نہ تو اس کلام کی کوئی نقل ممکن ہے، نہ ہی اس قرآن میں کسی قسم کی تحریف کی کوئی گنجائش ہے۔ اس کے بعد ہم قرآنی اصطلاح ''آیۃ'' کو دیکھتے ہیں جس کے معنی 'نشانی' یا 'معجزہ' ہیں۔ یہ اصطلاح خود اللہ تعالیٰ قرآن کی آیات کے لیے استعمال فرماتے ہیں۔ اس لفظ آیت میں ہمیں یہ آسمانی اشارہ ملتا ہے کہ اس کتاب 'قرآن' میں ایک اعجاز بحیثیت مجموعی بھی موجود ہے اور ساتھ ہی اس کتاب کے تمام لسانی اجزاء میں بھی، چاہے وہ مختصر ہوں یا طویل، ایک چیلنج مضمر ہے اور آخر میں ہم ایک اصطلاح ''تلاوۃ'' کی طرف آتے ہیں۔ یہ اصطلاح فعل 'یتلو' سے بنائی گئی ہے جس کے معنی ہیں پیچھا کرنا، اتباع کرنا یا بعد میں آنا۔ لفظ قرآن کا 'پڑھنے' کے معنی میں استعمال ایک آسمانی حکم کے بعد شروع ہوا، جس میں کہا گیا کہ رسول اللہ ﷺ زمین پر قرآن پڑھنے والے پہلے شخص نہیں ہیں بلکہ محض ایک مقتدی ہیں، کیونکہ پہلی مرتبہ تو حضرت جبرئیل امین نے قرآن پڑھا، پھر پیغمبر علیہ السلام نے ہو بہو ان کی نقل میں پڑھا اور اب ہم رسول اللہ ﷺ کے طریقہ پر پڑھتے ہیں۔

یہاں یہ امر قابل لحاظ ہے کہ ''قرآن'' دنیا کی وہ واحد کتاب ہے جو اپنے نزول کے دن سے آج تک اپنے اندر کچھ ایسی خصوصیات مسلسل اپنائے ہوئے ہے جو دنیا کی کسی اور کتاب کو نصیب نہیں ہیں۔ یہاں جو تقابل پیش کیا جا رہا ہے وہ اس بنیاد پر نہیں ہے کہ قرآن کا موضوع، اس کے نظریات، زبان یا اسلوب جداگانہ ہیں۔ یہ تو دنیا کی ہر کتاب کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ اس میں چند ایسی خوبیاں ہیں جو دوسری کتب سے اسے 'موضوع، اپنے پیش کردہ نظریات اور لسانی طرز کے لحاظ سے منفرد بنا دیتی ہیں۔ اس حقیقت کے برخلاف میں جو بات کہہ رہا ہوں وہ یہ ہے کہ ''قرآن'' ایک کتاب ہوتے ہوئے بھی اپنی تہہ در تہہ خوبیوں کی وجہ سے کسی 'کتاب' کی تعریف پر قیاس نہیں کی جا سکتی۔

مثال کے طور پر، اگر آپ اس کتاب کا جو اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے، اپنی لائبریری میں موجود کسی بھی کتاب سے مقابلہ کریں تو آپ کو اس کتاب میں کوئی ایسی چیز نہیں

ملے گی جو اسے بحیثیت کتاب دوسری کتابوں سے ممیّز کر سکے۔ اگر ہم انگریزی زبان کی کسی کتاب کا مقابلہ عربی کی کسی کتاب سے کریں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ دونوں کتابیں دو واضح خصوصیات کی وجہ سے ایک دوسری سے مختلف ہیں: ایک تو کتابوں کی زبان مختلف ہے اور دوسرا فرق یہ کہ دونوں زبانیں مخالف سمت سے لکھی اور پڑھی جاتی ہیں (انگریزی کی کتاب بائیں سے دائیں جانب اور عربی کی کتاب دائیں سے بائیں جانب)۔ ان دونوں کتابوں کے درمیان زیادہ سے زیادہ فرق بس یہی ہوگا۔

پھر بھی ان دونوں اختلافات کی بنیاد پر بھی دو مختلف زبانوں میں لکھی ہوئی کتابیں دنیا کی دوسری کتابوں سے الگ کسی ''قسم'' میں شمار نہیں کی جاسکتیں۔ دنیا میں انگریزی اور عربی زبان میں لکھی ہوئی دوسری لاکھوں کتابیں موجود ہیں۔ اس حقیقت کے برخلاف، ''قرآن مجید'' ایسی کتاب ہے جس میں بہت سے ایسے اوصاف ہیں جو ہماری دنیا کی دوسری تمام کتابوں میں سے کسی میں بھی نہیں پائے جاتے۔ نہ ہی انسانی تاریخ کی کسی سابقہ کتاب میں ان اوصاف کی کوئی مثال ملتی ہے۔ میں نے خود بیس (20) ایسے اوصاف شمار کیے ہیں جن میں سے بارہ (12) ذیل میں درج ہیں:

1۔ قرآن کے سیپاروں (ابواب) اور آیات کے حوالہ کے لیے اچھوتی اصطلاحات استعمال کی گئی ہیں۔

2۔ قرآن کی تلاوت کے ایک سے زیادہ طریقے ہیں اور تمام طریقے آسمانی ہدایت کے مطابق درست اور تسلیم شدہ تصور کیے جاتے ہیں۔

3۔ قرآن کی تلاوت کا انداز اس کی تحریری زبان سے مختلف ہے۔ مثلاً یہ الفاظ دیکھئے، نماز کے لیے ''الصلوٰۃ''، اسی طرح ''الزکوٰۃ'' اور ''الحیواۃ'' (زندگی) جو قرآن میں حرف 'و' کے ساتھ لکھے جاتے ہیں لیکن 'الف' کی طرح کھینچ کر پڑھے جاتے ہیں (جیسے ہات، بات، کات میں)۔ اسی طرح کی ایک اور مثال لفظ ''قواریرا'' ہے جو سورۃ دھر (الانسان 76:16) میں وارد ہوا ہے۔ اس لفظ کو بغیر 'الف' کے 'رَ' کی طرح پڑھتے ہیں حالانکہ 'الف' لکھا جاتا ہے۔

4۔ قرآن کی عبارت کا دنیا بھر میں لکھی جانے والی دوسری عربی عبارات سے مختلف انداز میں تلفظ کیا جاتا ہے۔ قرآن کی تلاوت کا یہ منفرد طریقہ 'فن تجوید' کے ذریعہ بہت تفصیل سے واضح کر دیا گیا ہے۔ یہ فن تلفظ اور صوتی حسیات کے انتہائی محکم اصولوں پر قائم کیا گیا ہے۔

5۔ قرآن کی عبارت کا املا عربی زبان کی دوسری تمام عبارات سے مختلف ہے (اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کی عبارت املا کرنے کے قواعد نہ صرف جدید عربی، بلکہ چودہ سو سال پہلے لکھی جانے والی عربی کے قواعد سے بھی مختلف ہیں)۔

6۔ قرآن کو ضبط تحریر میں لانے کا ایک ہی مسلمہ اصول ہے کہ دوسرے لوگ اس کی جہری تلاوت کس طرح کرتے ہیں۔ تجوید کے اصولوں پر مکمل انحصار کے علاوہ قرآن کی تحریر کا طریقہ ایک ایسے زبانی سلسلۂ نشر و نقل کی مضبوط بنیاد پر ہے جو مستند درمیانی واسطوں سے ہوتا ہوا خود محمدؐ رسول اللہ تک پہنچتا ہے۔

7۔ قرآن کو ایک مترنم لحن میں پڑھا جاتا ہے، جیسا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''قرآن کو مترنم پڑھو، جو شخص اس طرح نہیں پڑھتا وہ ہم میں سے نہیں ہے[7]'' ہم میں سے نہیں ہے'' کا مطلب یہ ہے کہ وہ رسول اللہ، کی پیروی نہیں کر رہا۔

8۔ قرآن کا لسانی طرز بیان اس شخص پاک ﷺ کے روزمرہ طرز بیان سے مختلف ہے جس نے قرآن ہم تک پہنچایا یعنی نبی پاک محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

9۔ پوری دنیا میں کروڑوں لوگ ایسے موجود ہیں، جنہوں نے قرآن مجید از اول تا آخر حفظ کر رکھا ہے۔

حفاظ قرآن میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو نہ عربی بولتے ہیں، نہ ہی سمجھتے ہیں۔ اہل عرب دنیا کی آبادی کے بیس فیصد سے زیادہ نہیں ہیں۔

11۔ قرآنی متن کے مختلف نمونے روزانہ لاکھوں مرتبہ مساجد میں قرأت میں پڑھے جاتے ہیں، یعنی فجر، مغرب اور عشاء کی باجماعت فرض نمازوں میں، ان کے علاوہ جمعہ کی نماز باجماعت اور عیدالفطر و عیدالاضحیٰ کی باجماعت نمازیں بھی ہیں، جو بآواز بلند یعنی

جہری پڑھی جاتی ہیں۔ یہ نمازیں دنیا بھر کی لاکھوں مساجد میں اسی طرح تواتر سے پڑھی جارہی ہیں جس طرح پہلے دن نماز کا حکم نازل ہوا تھا۔ اگر امام اپنی تلاوت قرآن میں تلفظ کی، یا الفاظ کی ادائیگی میں کوئی بھی غلطی کرتا ہے تو مقتدیوں میں بے شمار ایسے لوگ ہوتے ہیں جو امام کی غلطی کو فوراً بلند آواز میں درست کر دیتے ہیں۔ فوری اور مستند تصحیح کے اس نظام کی موجودگی میں کسی بھی امام کے لیے یہ ممکن ہی نہیں رہتا کہ وہ قرآن کے متن میں کسی ایک لفظ کی بھی کمی، بیشی کر سکے یا کسی اور طریقہ کا ردوبدل کر کے الہامی، مقدس متن کو آلودہ کر سکے۔

12۔ قرآن نے مختصر ترین عرصہ میں ایک ایسا عالمی سائنسی انقلاب برپا کیا جس سے یہ دنیا اس وقت تک ناواقف تھی۔ قرآن کے علاوہ دنیا کی کوئی کتاب ایسی نہیں ہے جس نے حیات انسانی کی پوری تاریخ میں ایسا ادبی، سائنسی، عقلی اور لسانی انقلاب محض چند دہائیوں میں برپا کیا ہو اور وہ بھی ایک ایسے دور دراز صحرائی خطہ میں جہاں لوگوں کی اکثریت ان پڑھ تھی اور کتاب کے نام پر صرف انجیل مقدس سے ان کی شناسائی تھی۔

جدید لسانیاتی تشکیل

دیگر لسانی گروہوں کے ماہرین اور ادیبوں کی طرح قبل اسلام کے شعرا نے بھی اشتراک باہمی کے اصول پر لسانی تراکیب اور ہیئتوں پر مشتمل ایک مجموعہ ترتیب دے رکھا تھا جس میں سے وہ حسب ضرورت اپنے خیالات کے اظہار کے لیے کوئی ہئیت منتخب کر کے استعمال کر لیتے تھے اور شاذ و نادر ہی ایسا ہوتا تھا کہ ان مروجہ ہیئتوں اور ادبی اسالیب اظہار سے کوئی انحراف کرتا ہو۔ اس طریقہ کار کے نتیجہ میں چند گنی چنی اصناف سخن تھیں جو پہلے سے طے شدہ سانچوں پر مشتمل تھیں اور تازہ کلام کہنے کے لیے ایک ڈھیلا ڈھالا سانچہ اور بنیاد فراہم کر دیا کرتی تھیں۔ ہمارے زمانہ تک باقی رہ جانے والی اسلام سے پہلے کی تمام شاعری میں ہمیں سیکڑوں بنیادی لسانی سانچے ملتے ہیں جو نزول قرآن سے قبل، اس وقت کے بازار شاعری میں زیر گردش تھے اور یہی لسانی سانچے قبل اسلام کے ''قصیدہ'' یا نظم گوئی کا ڈھانچہ ترتیب دینے کے کام آتے تھے۔ نزول قرآن کے بعد بھی ان قدیم سانچوں کا استعمال جاری رہا اور موجودہ دور کے کئی شعرا اب بھی ان کا استعمال کم و بیش کر ہی رہے ہیں۔ یہ لسانی سانچے ابتدائی لسانی اکائیوں کے حکم میں تھے جو کسی نظم یا نثری ادب پارہ کی بنیاد فراہم کرنے کی خدمت انجام دیتے تھے۔ بہت کم ہی ایسا ہوتا تھا کہ کوئی شاعر، مصنف یا خطیب ان مروجہ سانچوں سے ہٹ کر کچھ کہنے کی جرأت کرے یا کوئی نئی ہیئت ایجاد کر کے پرانی لسانی عمارت کو مزید نکھارنے کی کوشش کرے۔

ان مروجہ ادبی سانچوں کی مثال ایسی ہی ہے جیسے تصویری معمہ (Jig Saw Puzzle) کے مختلف ٹکڑے یا تاش کے پتے۔ ماہرین ادب کو پہلے سے تیار شدہ ادبی ٹکڑے مل جاتے ہیں جن کو مناسب ترتیب دے کر وہ کوئی ادبی تخلیق، نظم یا نثر مرتب کر لیتے ہیں۔ اس طرح کہی ہوئی نظم اس کے قاریوں یا سامعین کو بظاہر تو نئی محسوس ہو گی لیکن درحقیقت ان ادبی شہ

پاروں کی حیثیت اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی کہ پرانے نقشوں اور خام مال کو نئی عمارت بنانے کے لیے استعمال کرلیا گیا ہو۔ ماقبل اسلام دور کے چند منتخب شعرا کے کلام کے ابتدائی مصرعوں پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے سے اس ادبی رجحان کی مثال ہمارے سامنے آجائے گی: **ومن یک ذا، وانی مشرؤ ان، ألا هل أتی عنا، ألا لیت شعری هل، الا انعم صباحا أیها الربع، خلیلی مرابی، أمن آل أسما الطلول الدوارس یا صاحبی تلوما، ودع أمامة پن، أهاجک من أسما رسم المنازل، سمالک شوق بعد ما کان، لمن طلل بین الجدیة .....** وغیرہ

جہاں تک وحی قرآن کی زبان کا تعلق ہے، اس نے ادبی اظہار کے تمام سابقہ مروجہ طریقوں کو تلپٹ کر کے رکھ دیا۔ اس نے قدیم و موروثی ادبی سانچوں کو توڑ پھوڑ ڈالا اور روایتی لسانی دھاگہ کو ہی مستعار لے کر اپنی پسند کا ایک ایسا لسانی تانا بانا ایجاد کیا جو نئی قسم کے لسانی سانچے اور نقشے ڈھال سکے۔ ان ہی نئے لسانی سانچوں نے عربوں کی ادبی زبان کے تمام میدانوں میں ایک طوفان برپا کر دیا۔ قرآن کی عطا کی ہوئی ان جدید ہیئتوں کا تعلق قرآن کے کسی مخصوص حصہ، یا اس کے پیش کردہ کسی مخصوص نقطۂ نظر تک محدود نہیں تھا بلکہ قرآن کی پیش کردہ جدید اصطلاحات اور تراکیب پورے قرآن پر یکساں محیط تھیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب ایک بار لوگ قرآن کی زبان کے عادی ہو گئے تو حالت یہ ہوگئی کہ قرآن کے متن کے کسی بھی نمونے کو، بلکہ محض ایک آیت کے نامکمل حصہ کو بھی ''قرآنی زبان'' کی حیثیت سے پہچاننے پر آسانی سے قادر ہو گئے۔

قرآن کی لسانی ساخت کے مختلف اجزا کا ''ذائقہ'' اتنا منفرد ہوتا ہے جو ہمیں اس غلط مفروضہ کی طرف لے جا سکتا ہے کہ اس نادر ''ذائقہ'' کو تو قرآن میں بار بار دہرایا گیا ہوگا تاکہ اس لسانی ساخت کی وجہ سے (جو موجودہ عربی کی ساخت یا عہد نبوی کی لسانی ساخت سے الگ ایک امتیازی شان رکھتی ہے) اور اس کے چند مخصوص اجزا کی تکرار سے ہم ''قرآنی زبان'' کو فوراً پہچان لیں۔ اب حیرانی کی بات یہ ہے کہ بلاشبہ قرآن میں چند خاص بندشوں کی تکرار ہے، پھر بھی ان ساختوں اور کلمات کی تعداد جو دہرائے نہیں گئے ہیں ان کلمات سے کہیں زیادہ ہے جو مکرر استعمال ہوئے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ زیادہ تر یکتا و منفرد ساختیں اور لسانی مظاہر جن سے قرآنی زبان پہچانی جاتی ہے، وہ صرف ایک مرتبہ ہی ظہور پذیر ہوئے ہیں۔ اس عنقا استعمال کے

باوجود ان کا جداگانہ اور امتیازی ذائقہ برقرار رہتا ہے۔ اب جہاں تک غیر قرآنی عربی کی ساختوں کا تعلق ہے، چاہے وہ نثر میں ہوں یا نظم میں، ہمیں ان کو پہچاننے اور درست مصنف کے ساتھ متعلق کرنے میں خاصی دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے، جب تک کہ وہ کلام میں بار بار نہ وارد ہوں اور ہم ان کو سن کر یا پڑھ کر ان سے خوب مانوس نہ ہو چکے ہوں۔ لہٰذا، قرآنی زبان کا ایک اور معرکۃ الآراء وصف وہ آسانی ہے جس سے ہم قرآنی اجزا کو بغیر تکرار کے بھی پہچان لیتے ہیں اور ان سے ذرا میں مانوس ہو جاتے ہیں۔

اس موقع پر کوئی صاحب اعتراض کر سکتے ہیں کہ آپ یہ دعویٰ کس بنا پر کر رہے ہیں کہ صرف قرآن میں ہی یکتا و منفرد کلمات اور ساختوں کی قسمیں استعمال ہوئی ہیں؟ کیا دنیا کے ہر مصنف کا اپنا ایک طرز بیان، الفاظ کا چناؤ، اسلوب اظہار اور اصطلاحوں کا استعمال نہیں ہوتا، جن سے وہ شناخت پاتا ہے؟ ایک حد تک یہ بات درست ہے۔ پھر بھی انسانی زبان میں اسلوب اور طرز نگارش ایک دوسرے سے کتنے ہی مختلف ہوں، کتنے ہی یکتا و یگانہ ہوں اور مصنفین میں کتنا ہی بعد زمان و مکان ہو، ہم نثر و نظم کے مختلف نمونے سامنے رکھ کر قطعیت کے ساتھ یہ نہیں بتا سکتے کہ یہ نثر یا نظم فلاں لکھنے والے کی کاوش ہے۔ اکثر و بیشتر ایسا ہوتا ہے کہ دو یا اس سے بھی زیادہ لکھنے والوں کا طرز تحریر اتنا ملتا جلتا ہوتا ہے کہ ہم انہیں پہچاننے میں تذبذب کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہ حقیقت اس وقت اور بھی کھل کر سامنے آ جائے گی اگر ہم کسی مشہور مصنف کا ایک جملہ اس کے خزانہ تحریر سے چن لیں اور اس کا دوسرے مصنفین کے چند جملوں سے مقابلہ کریں۔ مثال کے طور پر ہم مختلف ادوار کے پانچ عرب مصنفین کے ذخیرۂ تحریر سے ایک ایک جملہ لے لیں- پانچ زیر مثال مصنفین یہ ہیں۔ المعرّی، ابن المقفع، ابن حزم، طہٰ حسین اور مصطفیٰ صادق الرافعی- اور کسی (عالم، فاضل) شخص سے درخواست کریں کہ ہر جملہ کے مصنف کا درست حوالہ ہمیں دیدے:

بلا تخصیص منتخب جملے درج ذیل ہیں:

1. وأما الكتاب فجمع حكمة ولهوا
2. وان هذا اليولد من الحزن والأسف غير قليل
3. يبتدعون أساليب ومناهج فى نظم الكلام

4. لا یخاف علی ولده من الیتم

5. ولکن الفن البیانی یرتفع علی ذلک

تو یہ شخص کتنی ہی اعلیٰ ادبی قابلیت کا حامل ہو یا کتنا ہی دقیق ناقد کیوں نہ ہو، اور عربی اس کی مادری زبان ہی ہو، پھر بھی اس کے لیے مذکورہ مصنفین کے نام، نمونۃً لیے گئے پانچ جملوں کے ساتھ درست طور پر جوڑنا ناممکن ہوگا سوائے اس کے کہ اتفاقاً ایسا ہو جائے۔[8] اب دوسری طرف اگر ہم ان پانچوں انسانی مصنفوں کے جملوں میں صرف ایک قرآنی آیت، کوئی سی بھی آیت، خواہ طویل یا مختصر تحریر کر دیں تو قرآن کا کوئی مبتدی قاری بھی بڑی آسانی سے آیت شناخت کر کے بتا دے گا کہ یہ قرآن پاک کی آیت ہے۔

انتہائی نادر قرآنی تراکیب

منفرد و یکتا قرآنی ساختوں اور طریقہ ہائے بیان کی ایک ایسی کثیر تعداد ہے جو صرف ایک مرتبہ ہی وارد ہوئے ہیں، دوبارہ کہیں نہیں پائے جاتے اور ہم آسانی سے انہیں قرآن کے کسی بھی صفحہ پر پہچان سکتے ہیں۔ خود کو یہ یقین دلانے کے لیے کہ ہم نے جو نتائج اخذ کیے ہیں وہ حقیقی دانش پر مبنی ہیں نہ کہ محض مفروضات اور ذاتی پسند پر۔ ہم قرآن کریم کا پہلا مکمل صفحہ لیتے ہیں جس میں سورۃ بقرۃ کی آیات 6 سے 16 تک، زیادہ تر طبع شدہ قرآن کریم کے نسخوں میں ملتی ہیں۔ یہ چھوٹا سا نمونہ بھی اس بات کو واضح کرنے کے لیے کافی ہے کہ یہ منفرد قرآنی ساختیں اور بیانات کے انداز کتنے متعدد اور متنوع ہیں۔ اس ایک صفحہ پر ہمیں 23 ساختیں ملتی ہیں اور ان میں سے ہر ایک ساخت ان تمام ساختوں اور انداز ہائے بیان سے ہی نہیں جو پورے عربی نثری وشعری ادب میں استعمال ہوئی ہیں یا احادیث نبوی میں ملتی ہیں، بلکہ ان تمام دوسری قرآنی ساختوں اور مظاہر سے بھی بالکل الگ تھلگ ''یکتا و منفرد'' نظر آتی ہیں جو اسی صفحہ پر موجود ہیں، ہم دیکھیں گے کہ ان ساختوں کی یکتائی وانفرادیت قرآن کریم کے ساتھ ہی مخصوص ہے اور صدیوں سے عربی ادب پر قرآن کے لسانی وادبی گہرے اثرات کے باوجود انسانی انداز بیان سے بآسانی علیحدہ پہچانی جا سکتی ہیں۔ گزشتہ کی صدیوں کے ادب کا مطالعہ کر لیجئے۔ اس طرح کا

کوئی ادبی مظہر ہمیں دنیا کی کسی زبان میں بھی نہیں ملے گا۔ قرآن کا جو صفحہ ہم نے منتخب کیا ہے اس میں درج ذیل سات تیں ہیں جن کا ہم نے حوالہ دیا ہے:

1۔ **آیت6: سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لاَ يُؤْمِنُونَ**

﴿ان (کافروں) کے لیے یکساں ہے چاہے آپ انہیں ڈرائیں یا نہ ڈرائیں وہ ایمان نہیں لائیں گے﴾

2۔ **آیت7: وَلَهُمْ عَذَابٌ عظِيْمٌ**

﴿اوران کے لیے ایک بڑا عذاب ہے﴾

3۔ **آیت8: وَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ آمَنَّا**

﴿اورلوگوں میں سے کچھ ایسے ہیں جو کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے ہیں﴾

4۔ **آیت8: وَمَا هُم بِمُؤْمِنِيْنَ**

﴿حالاں کہ وہ ایمان والے نہیں ہیں﴾

5۔ **آیت9: وَمَا يَخْدَعُونَ إِلاَّ أَنفُسَهُم وَمَا يَشْعُرُونَ**

﴿اور وہ سوائے خود اپنے آپ کے کسی کو دھوکہ نہیں دیتے مگر وہ سمجھتے نہیں ہیں﴾

6۔ **آیت10،الف: فِيْ قُلُوبِهِم مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّهُ مَرَضاً**

﴿ان کے دلوں میں مرض ہے، پس اللہ نے ان کے مرض میں اور اضافہ کر دیا﴾

7۔ **آیت10،ب: وَلَهُم عَذَابٌ أَلِيْمٌ**

﴿اوران کے لیے دردناک عذاب ہے﴾ بالکل ویسی ہی جیسے اوپر ساخت ہے۔

8۔ **آیت10،ج: بِمَا كَانُوا يَكْذِبُونَ**

﴿اس وجہ سے کہ وہ جھوٹ بولتے تھے﴾

9۔ **آیت11،الف: وَإِذَا قِيْلَ لَهُمْ لاَ تُفْسِدُواْ فِيْ الأَرْضِ**

﴿اور جب ان سے کہا جاتا ہے زمین میں فساد برپا نہ کرو﴾

10۔ **آیت11،ب: قَالُواْ إِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُونَ**

﴿کہتے ہیں: ہم ہی تو اصلاح کرنے والے ہیں﴾

11۔ آیت12،الف: أَلا إِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُونَ
﴿خوب آگاہ ہو جاؤ! یہی لوگ (حقیقت میں) فساد کرنے والے ہیں﴾

12۔ آیت12،ب: وَلَـكِن لَّا يَشْعُرُونَ
﴿مگر انہیں (اس کام کا) احساس تک نہیں ہے﴾

13۔ آیت13،الف: وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ آمِنُواْ كَمَا آمَنَ النَّاسُ
﴿اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ (تم بھی) ایمان لاؤ جیسے (دوسرے) لوگ ایمان لے آئے ہیں﴾

14۔ آیت13،ب: قَالُواْ أَنُؤْمِنُ كَمَا آمَنَ السُّفَهَاء
﴿تو کہتے ہیں کیا ہم بھی (اسی طرح) ایمان لے آئیں جس طرح (وہ) بیوقوف ایمان لے آئے ہیں﴾

15۔ آیت13،ج: أَلا إِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَاء
﴿خوب آگاہ ہو جاؤ! بیوقوف (درحقیقت) وہ خود ہیں﴾

16۔ آیت13،د: وَلَـكِن لَّا يَعْلَمُونَ
﴿(لیکن وہ جانتے نہیں ہیں﴾ اوپر والی ساخت 12 کی تکرار

17۔ آیت14،الف: وَإِذَا لَقُواْ الَّذِينَ آمَنُواْ قَالُواْ آمَنَّا
﴿اور جب وہ (منافق) اہل ایمان سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم (بھی) ایمان لے آئے ہیں﴾

18۔ آیت14،ب: وَإِذَا خَلَوْاْ إِلَى شَيَاطِينِهِمْ
﴿اور جب اپنے شیطانوں سے تنہائی میں ملتے ہیں﴾

19۔ آیت14،ج: قَالُواْ إِنَّا مَعَكُمْ إِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِئُونَ
﴿وہ کہتے ہیں، تحقیق ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ ہم تو (مسلمانوں سے) محض مذاق کر رہے ہیں﴾ اوپر والی ساخت 10 کی تکرار

20۔ آیت15،الف: اللّهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ
﴿اللہ ان کا مذاق اڑاتا ہے﴾

21۔ آیت15،ب: وَيَمُدُّهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ
﴿اور انہیں ڈھیل دیتا ہے سو وہ خود اپنی سرکشی میں بھٹک رہے ہیں﴾

22۔ آیت16،الف: أُولَئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلاَلَةَ بِالْهُدَى
﴿یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خریدی﴾

23۔ آیت16،ب: وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ
﴿اور وہ ہدایت کی راہ جانتے ہی نہیں تھے﴾

اوپر دی گئی آیات کی فہرست ملاحظہ کرنے پر آسانی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس حصہ میں چار قرآنی طرز کی بناوٹوں کو دوبار دہرایا گیا ہے۔ اس کے باوجود پوری 23 آیات کی بناوٹ اور اظہار مطلب، نہ تو کسی اور غیر قرآنی عربی سے مماثل ہے، نہ ہی احادیث نبوی کے اظہار بیان سے۔ اسی لیے اگر ہم ان قرآنی بیان کے حصوں کو کسی اور عربی نثر پارے یا شاعری میں خلط ملط کرنے کی کوشش بھی کریں تو قاری فوراً پہچان لے گا کہ یہ قرآنی آیات کے ٹکڑے ہیں۔

اب سوال اٹھتا ہے کہ ساتویں صدی عیسوی میں موجود جزیرۃ العرب کے عربوں نے اس جدید طرز کے بیانیہ کے طوفان کا کس طرح استقبال کیا جو مکہ سے حملہ آور ہوا تھا۔ قرآن پاک کی منفرد زبان کی اس صدیوں پرانی لسانی روایت میں کیا حیثیت متعین کی جائے جس کی آبیاری قبل اسلام کے زمانہ میں ہوئی تھی۔ اب ان عربوں کا ردعمل کیسا ہوگا جو زبان وادب کے بازار میں محض چند سو تمثیلات اور لسانی اشکال کی حامل کتاب سے دوچار ہوئے، جن کی کوئی مثال ان کی سابقہ نظم ونثر میں موجود نہیں تھی، بلکہ مستقبل میں بھی جو ادب تخلیق کیا جائے گا وہ بھی اس طرح کی کوئی جدید زبان پیش کرنے سے قاصر رہے گا۔

قرآنی لسانی سانچے۔ ان کا مزاج اور ترتیب

وہ یگانہ روزگار خوبی جو قرآنی آیات کے طرز اور اس کے اپنے جداگانہ الفاظ، یا ان الفاظ کا دوسرے قرآنی الفاظ، تراکیب اور اسلوب اظہار سے تعلق میں ظاہر ہوتی ہے، ایک ایسی

منفرد زبان تخلیق کرتی ہے جسے فوراً شناخت کر لینے میں ایک عام قاری کو بھی شاید ہی کبھی کوئی مشکل پیش آئے۔ قاری قرآنی عبارت کو دوسرے انسانی اسالیب تحریر و بیان سے تقریباً فوراً ہی ممیّز کر لیتا ہے۔ وہ خاص خوبی جو قرآنی عبارت و بیان کو دوسرے عام انسانی بیان سے الگ پہچان عطا کرتی ہے محض قرآن کی وہ خاص ''اصطلاحات'' ہی نہیں ہیں جن سے ہمیں ہر ہر قدم پر سابقہ پڑتا ہے۔ نہ ہی یہ وہ خوبی ہے جو قرآنی عبارت کے الفاظ اور آیات کے اس ڈھانچہ میں مضمر ہے جس پر قرآنی زبان کی مخصوص عمارت تعمیر ہوئی ہے اور جس کا ایک منفرد لب ولہجہ ہے۔ یہ وہ خوبی بھی نہیں ہے جو قرآنی تشبیہات کی مسحور کن فطرت میں موجود ہے، نہ ہی اس آسمانی پیغام میں جو حکمت، تقدس، گیرائی، زمان ومکان کی حدود سے آزادی، اور تمام انسانی پیغامات کی بلند پروازیٔ تخیل اور ان کی بہترین مثالوں سے بھی بے انتہا ارفع واعلیٰ ہے، نہ ہی یہ وصف وہ آسمانی دعویٰ (الگ راستہ) ہے جو اپنی قابلیت، اعتماد، ماہرانہ صلاحیت، حاکمانہ انداز میں اس فانی انسان کی کمزوریوں سے مبرّا، بہت ہی اونچے درجہ پر فائز ہے۔ قرآنی متن کا منفرد معیار اوپر بیان کیے ہوئے تمام عناصر ترکیبی کے مرکب سے وجود میں آنے والے لسانی اجزا اور طرز بیان سے اتنا اعلیٰ اور مختلف ہے کہ اگر قرآنی الفاظ، جملوں یا آیت کے کسی حصہ کو انسانی تقریر وتحریر کی کسی بھی قسم، بشمول خطبہ، اقوال، قانونی دفعات اور تحریری جملوں کی ہزاروں مثالوں میں بھی خلط ملط کر کے رکھا جائے تو ''قرآن'' بالکل الگ سے پہچانا جاتا ہے۔

قرآنی بیان کے طرز یا سانچہ میں معمولی تبدیلی بھی اس بیان کو قرآنی عروض کی بحر سے خارج کر دے گی۔ سچ بات تو یہ ہے کہ قرآن نے جتنے طرز اختیار کیے ہیں، اتنی ہی اس کی عروضی بحریں ہیں۔ ان بحروں کی بنیاد نہ مروجہ اصول عروض پر ہے، نہ ہی ان انسانی کلام کے اصولوں پر جو حروف کی نشست و برخواست اور موزوں ترتیب پر منطبق ہوتے ہیں۔ درحقیقت قرآنی طرز انشا لاتعداد مقامات پر عروض کے اصولوں سے انحراف کرتا ہے اور اس کے باوجود یہی انحراف قرآنی طرزوں اور نمونۂ کلام کو ایک خاص روانی اور مہارت کلام عطا کرتا ہے۔ مثال کے طور پر درج ذیل آیت میں چھ 'میم' یکے بعد دیگر واقع ہوئے ہیں:

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّن مَّنَعَ مَسَاجِدَ اللّهِ أَن يُذْكَرَ فِيهَا اسْمُهُ

﴿بھلا اس سے زیادہ ظالم اور کون ہوگا جو مساجد میں اللہ تعالیٰ کی یاد (عبادت) سے روکے﴾، (بقرۃ 2:114)

جب تجوید[9] کے اصولوں کے مطابق اس آیت کی تلاوت کریں تو صوتی ادائیگی اس طرح ہوگی وَمَنْ أَظْلَمُ مِمْ مَمْ مَنَ....

سورہ ھود کی 11:48 ویں آیت میں ہمیں آٹھ میم اسی طرح متواتر ملتے ہیں: وَعَلَى أُمَمٍ مِّن مَّن مَّعَكَ.

﴿آپ پر اور ان لوگوں پر بھی جو آپ کے ساتھ ہیں﴾

اس آیت کو بھی تجوید کے مطابق پڑھیں تو اس طرح تلاوت ہوگی أُمَمٍ مَّمم مَّعَكَ.

اتنے سارے ''میمون'' کے تواتر کے باوجود یہ طبیعت انسانی پر ذرا بھی گراں نہیں گزرتے جب کہ اسی طرح کی تکرار حروف اگر کسی انسان کے تخلیق کردہ متن میں ہوتی تو صورت حال قطعی مختلف ہوتی۔

قرآنی عروض، لَے اور نغمگی کچھ اور ہی لطیف عناصر انشا پردازی کے مرہون منت ہیں جن عناصر کی تعریف اور تشریح، فن تنقید کے موجودہ دستیاب آلات سے نہیں ہوسکتی۔ اس مشاہدہ اور کیفیت کی تصدیق متعدد فلاسفۂ مغرب نے بھی کی ہے جنھوں نے اپنے مطالعۂ قرآن کے دوران اس کیفیت کو محسوس کیا ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ قرآن کا مطلب نہ سمجھ سکنے کے باوجود قرآنی آیات کے زیر و بم اور لحن کا ایک خاص نفسیاتی اثر ان پر ہوا ہے۔ مشہور مصنف جیفری لینگ ان فلاسفہ کے بارے میں لکھتے ہیں: ''جیسا کہ بہت سے نومسلم افراد کو معلوم ہے کہ قرآن کی اس فطری قوت کو محسوس کرنے کے لیے پہلے سے مسلمان ہونا ضروری نہیں ہے، چونکہ ان میں سے بہت سے لوگوں نے بعد میں اسلام قبول کیا اور قبولیت اسلام کی وجہ بھی قرآن کی اثر آفرینی ہی تھی۔ ان کے علاوہ بہت سے غیر مسلم علماء و دانشوروں نے بھی یہ بات تسلیم کی ہے۔ عربی زبان کے ایک برطانوی عالم جناب آرتھر جے۔ آربیری نے اپنے وہ تاثرات بیان کیے ہیں جب قرآن نے ان کی ایک سخت مشکل وقت میں مدد کی۔ انھوں نے فرمایا کہ قرآن کی تلاوت سنتے وقت وہ ایسا محسوس کرتے تھے جیسے وہ خود اپنے دل کی دھڑکن اس لَے میں سن رہے ہوں''۔ ایک

اور غیر مسلم مصنف فریڈرک ڈینی اپنے تاثرات ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں کہ ''ایک ایسا خوشگوار، مگر بے چین کر دینے والا تجربہ'' جو قرآن کے قاری کو ایک غیر مرئی وجود کی موجودگی کے احساس سے خوفزدہ کر دیتا ہے۔ قاری کو ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ وہ قرآن نہیں پڑھ رہا ہے بلکہ قرآن قاری کو ''پڑھ'' رہا ہے۔[10]

(بقول شاعر: ''میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے'' مترجم)

بہرنوع، اس نئی قسم کی قرآنی زبان کی اصلیت کا کھوج لگانے میں منہمک ہو کر ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ یہ ''نیا پن'' آج چودہ سو سال گزرنے کے باوجود ''نیا'' ہی ہے۔ ایک انسان جو کچھ آج بالکل نیا کہتا ہے وہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پرانا ہو ہی جاتا ہے۔ زمانہ قبل اسلام میں جو نئے انداز کسی شاعر نے عربی زبان میں پہلی مرتبہ متعارف کرائے تھے وہ اس وقت بالکل جدید تھے لیکن زیادہ وقت نہیں گزرا ایک بعد دیگرے دوسرے شعراء نے اسی طرز شاعری کو بار بار اپنے کلام میں استعمال کیا، حتی کہ وہ اپنی جدت کھو کر پرانے ہو گئے، لیکن جہاں تک قرآنی لسانی نمونوں کا تعلق ہے، ان کے بارے میں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے انھوں نے وقت کے ان لمحات کو منجمد کر دیا ہو جن میں وہ پہلی مرتبہ نازل ہوئے تھے، کیونکہ بے شمار مرتبہ دہرائے جانے کے باوجود ان کی تازگی بدرجہ اتم برقرار ہے۔

پیغمبر اسلام محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو زبان استعمال کرتے تھے اس کی دو نمایاں صورتیں تھیں: ایک تو حدیثِ قدسی، یعنی وہ حدیث جس کے معنی اور مفاہیم حضور ﷺ پر وحی کی طرح القا ہوتے تھے اور پھر حضور ﷺ اس وحی کو اپنے الفاظ میں آگے پہنچاتے تھے، دوسری وہ حدیث جو حضور ﷺ کے اپنے خیالات، مطالب اور انہی کے الفاظ پر مشتمل ہوتی تھی۔ ان دونوں قسم کی احادیث کی زبان میں ایک اعلیٰ درجہ کی سلاست، روانی اور حسن کلام ہے۔ اس کے باوجود اس زبان میں بہرحال انسانی کلام کے اوصاف موجود ہیں جو بلاشبہ صاف پہچانے جاتے ہیں اور اس کلام حدیث کو قرآن کے ناقابل تقلید، الوہی کلام سے ممیّز کر دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر ذرا تصور کیجئے کہ ایک فیکٹری کا منتظم اپنے اہل کاروں کے سامنے تقریر کرتا ہے اور وہ یہ پیغام دینا چاہتا ہے کہ ہر اہل کار اپنی غلطیوں کے لیے خود ذمہ دار ہے۔ یہ پیغام پہنچانے کے لیے منتظم ایک مشہور

قرآنی آیت کے اس حصہ سے زور کلام پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَى ﴿اور کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا﴾ (فاطر 35:18)۔ اب براہ راست اس آیت کے حصہ کا حوالہ دیئے بغیر وہ اپنے الفاظ میں یہی پیغام پہنچانا چاہتا ہے۔ قرآنی طرزِ کلام کی نقل کی کوشش میں یہ منتظم صاحب عربی مجرد ثلاثی (بنیادی فعل) وَزَرَ کی جگہ ایک ہم معنی فعل حَمَلَ استعمال کرتے ہیں اور کہتے ہیں، ولا تحمل حملة أخرىٰ. اس انسانی مخصوص قرآنی طرز بیان کو مستعار لینے کی کوشش میں یہ صاحب درست حوالہ کے عمل سے یا جملہ میں تصرف کے عمل سے کہیں دور چلے جاتے ہیں۔ وہ جملے کی ساخت تو من وعن رکھتے ہیں لیکن درمیان میں اپنے ذاتی الفاظ داخل کر دیتے ہیں جو آیت کے اصل الفاظ کے ہم معنی بھی ہیں اور عروضی بحر میں بھی کوئی خلل واقع نہیں ہوتا۔ لیکن ہوتا کیا ہے؟ اس طفلانہ حرکت سے انجام کار یہ صاحب لسانیت کے تناظر میں ایک ایسا مسخ شدہ جملہ تخلیق کرتے ہیں جو صرف مضحکہ خیز ہی ثابت ہوتا ہے۔

''پھر اس جیسی ایک سورت ہی بنا لاؤ'' (قرآن 10:38)۔ یہی وجہ تھی کہ قرون اولیٰ کے مسلمان بزرگ ان حضرات کے ساتھ طنز وتمسخر کا رویہ روا رکھتے تھے جو قرآنی آیات کی بھونڈی نقل اس لیے تیار کر کے لاتے تھے تاکہ عام مسلمانوں کو قرآن اور اسلام سے یہ کہہ کر برگشتہ کر سکیں کہ یہ بھی قرآن کی سورتیں ہیں، اسی وجہ سے آج ہم بھی ان لوگوں پر ہنستے ہیں جو اس قسم کی مضحکہ خیز کوشش کرتے ہیں۔ یہ شریر لوگ جس قدر چاہیں کوشش کر دیکھیں، کہ قرآن میں کوئی عبارت، آیت یا آیت کا ایک حصہ ہی داخل کر دیں جو اصل قرآن نہ ہو، یہ لوگ قرآن کی زبان کے اس اعلیٰ معیار، انتہائے ہنر اور منفرد انداز کے قریب بھی نہیں پھٹک سکتے۔ خود قرآن کا اپنا طرز، جملوں، یہاں تک کہ الفاظ کی انفرادیت، ان جیسے لوگوں کے جھوٹ اور فریب کا پردہ فاش کر دیتی ہے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ ہمارے اس سائنسی ترقی یافتہ دور میں ڈی۔ این۔ اے۔ (D.N.A) ٹیسٹ کے ذریعہ کسی بچہ کے اصل باپ کی شناخت کر کے اس شخص کو بری الذمہ ثابت کر سکتے ہیں جسے غلط طریقہ سے الزام لگا کر مجرم بتایا جا رہا ہو۔ قرآن کی زبان ایسی خاص ہے کہ بیرونی ذرائع سے اس کے جسم میں کسی اور گروپ کے لسانی خون کی آمیزش ممکن ہی

نہیں ہے۔ جیسے ہی غیر مطابق لسانی خون اس میں داخل کریں گے تو قرآن کی اصل عبارت کو نقصان پہنچنے سے پہلے ہی بیرونی مداخلت رد کردی جائے گی۔

وہ انداز واطوار جو نبی کریم ﷺ کی بول چال کا خاصہ تھے:

ہمارے پاس رسول اللہ ﷺ کی فرمائی ہوئی باتوں کا ایک بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ کیا وہ اصول اور خواص جو اللہ تعالیٰ کے کلام میں ہیں، وہی حضور ﷺ کے کلام پر بھی منطبق ہوں گے؟ اگر ہم رسول اللہ ﷺ کے کلام میں بھی بیرونی الفاظ اور جملے خلط ملط کر دیں تو کیا وہی مضحکہ خیز صورت حال سامنے آئے گی جو قرآنی متن کو بدلنے کی صورت میں آئی تھی؟ اس بات کا تیقن کیسے ہو کہ حضور ﷺ کا کلام، خواہ کتنا ہی ارفع واعلیٰ، بلیغ اور یکتائے زمانہ ہو، پھر بھی ایک انسان کا کلام ہے جس میں ردوبدل اور بگاڑ کی گھناؤنی کوشش بہرحال ممکن ہے۔ چلئے ایک مرتبہ پھر معروضی اور من پسند طریقۂ تحقیق اختیار کرنے کے بجائے اور جیسی بھی صورت حال سامنے آئے ایمانداری سے اسے مان لینے کے اصول پر عمل کرنے کے لیے جو ہم نے قرآنی آیت کو پرکھنے کے سلسلہ میں اختیار کیا تھا، وہی طریقہ ہم حدیث کے سلسلہ میں بھی اپنائیں گے۔ اسی اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم نے گزشتہ صفحات میں سورۃ بقرۃ کی ابتدائی آیات اور سورۃ مدثر کی چند آیات پر (جو شان نزول کے اعتبار سے قرآن کی ابتدائی سورتوں میں سے ہے) نظر ڈالی تھی۔ آیئے اب ہم امام نووی کے مجموعۂ احادیث ''ریاض الصالحین'' سے (جو مشہور ترین اور قابل اعتماد مجموعہ ہائے احادیث میں سے ایک ہے) پہلے باب کی ایک حدیث کی زبان کا قرآنی زبان سے موازنہ کرتے ہیں۔ اس حدیث میں ہمیں اللہ سبحانہ وتعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کے کلام میں ایسا واضح فرق نظر آتا ہے جس کو پہچاننے میں کسی غلطی کا کوئی امکان نہیں ہے۔

حضرت عمر بن خطابؓ نے فرمایا: ''میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے، اعمال کا دار ومدار نیتوں پر ہے، اور ہر شخص کو اس کی نیت کے مطابق اجر ملے گا، اگر کوئی شخص اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی خاطر ہجرت کرتا ہے تو اس کا اجر اسے اسی نیت کے مطابق عطا ہوگا، لیکن اگر کوئی شخص اپنے کسی دنیاوی مقصد کو پورا کرنے کے لیے یا کسی خاتون سے شادی کرنے کی نیت سے

ہجرت کرتا ہے تو اس کے عمل کا فیصلہ اسی نیت کے اعتبار سے ہوگا۔'' (متفق علیہ)[11]

ہم میں سے کوئی بھی رسول اللہ ﷺ کے ابتدائی کلمات کی ساخت سے بآسانی اپنا تاثر قائم کرسکتا ہے۔ عربی میں یہ کلمات ہیں ''اِنَّمَا الاعمَالُ بِالنِّیَّات'' (جن کا ترجمہ: ''اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے'' اوپر دیا جاچکا ہے)۔ محض مثال سے بات واضح کرنے کی خاطر یہی بات یوں بھی کہی جاسکتی ہے کہ اِنَّمَا العِبرَۃُ بِالنَّتَائِجِ (جیسے محاورۃً کہیں کھیر کا ذائقہ تو چکھنے کے بعد ہی معلوم ہوتا ہے) اور اس طرح بھی کہنے والے کو یہ خوف نہیں ہوگا کہ وہ مروجہ لسانی اصولوں کی خلاف ورزی کررہا ہے یا کوئی اس بات کو غلط مان کر مذاق اڑائے گا۔ اسی طرح بڑی آسانی سے آپ حدیث کے دوسرے حصہ کی ساخت کے مطابق اپنی بات مختلف الفاظ میں کہہ سکتے ہیں۔ حدیث کے اصل الفاظ ہیں: ''وَاِنَّمَا لِکُلِّ امرِئٍ مَا نَوَیٰ'' (ترجمہ: اور ہر شخص کو اس کی نیت کے مطابق اجر ملے گا)۔ آپ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ''وَاِنَّمَا لِکُلِّ مُتَسَابِقٍ مَا أَحرَزَ'' (مقابلہ میں ہر شریک کو صلاحیت کے اظہار کے مطابق انعام ملے گا)۔ اس طرح اظہار خیال کے وقت کہنے والے کو ہرگز یہ خوف دامن گیر نہیں ہوگا کہ یہ کوئی مہمل کلمہ ہے، یا سننے والے اس کا مذاق اڑائیں گے۔ اسی طرز پر عمل کرتے ہوئے آپ اس حدیث کے بقیہ حصہ کو بھی عام زبان میں اپنے الفاظ استعمال کرتے ہوئے بیان کرسکتے ہیں۔ اسی طرز بیان کی نقل کرتے ہوئے 'فَمَن کَانَت ھجرَتُہ اِلَی اللہ وَرَسُولِہ فَھِجرَتُہُ اِلی اللہ وَرَسُولِہٖ' (اگر کوئی شخص اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی خاطر ہجرت کرتا ہے تو اس کا اجر اسے اسی نیت کے موافق عطا ہوگا، آپ اس حصہ حدیث کو دوسرے الفاظ میں اس طرح بھی کہہ سکتے ہیں 'فَمَن کَانَت غَایَتُہُ الخَیر، فاَجرُہُ عَظِیمٌ' (اگر کسی شخص کا مطمح نظر کوئی نیک کام کرنا ہے تو اس کا بہت بڑا ثواب ملے گا)۔ اسی طرح 'وَمَن کَانَت ھجرَتُہُ لِدُنیَا یُصِیبُھَا أَو اِمرَأۃ یَنکِحُھَا، فَھِجرَتُہُ اِلَی مَا ھَاجَرَ اِلَیہِ' (لیکن اگر کوئی شخص اپنے کسی دنیاوی مقصد کو پورا کرنے کے لیے یا کسی خاتون سے شادی کرنے کی نیت سے ہجرت کرتا ہے تو اس کے عمل کا فیصلہ اسی نیت کے اعتبار سے ہوگا)، آپ اسے اپنے الفاظ میں یوں بھی کہہ سکتے ہیں، **ومن کانت غایته ماله یربحه او شهرة ینالها، فاجره هو ما اختار لنفسه** (اگر کسی کا مطمح نظر (ہجرت کے ذریعہ) دولت کمانا ہے یا

شہرت حاصل کرنا ہے تو اس عمل کا بدلہ بھی ویسا ہی ملے گا جو عمل کرنے والے نے اپنے لیے چنا ہے، اور اس طرح اپنا مطلب بیان کرنے سے آپ کے قاری یا سامع کی طرف سے آپ کو کسی اعتراض یا ہتک کا اندیشہ نہیں ہوگا۔

درحقیقت ایسا ہوا بھی ہے کہ صحیح احادیث نبوی کے عظیم مجموعات میں غیر درست اور من گھڑت یعنی موضوع احادیث داخل کرنے کی سعی شدومد سے کی گئی ہے۔ پھر بھی ہمارے علمائے کرام نے درست اور موضوع احادیث میں فرق کر لینے میں ایسی کامیابی حاصل کی ہے کہ ایسی تمام کوششیں ناکام ثابت ہوئی ہیں۔ یہ کامیابی دراصل اس نظام اور دستاویزی طریقۂ کار کی وجہ سے ممکن ہوئی ہے جو احادیث نبوی کو محفوظ کرنے کے لیے وضع کیا گیا ہے۔ اس نظام کے تحت، تقریباً کامل یقین کے ساتھ صحیح اور موضوع احادیث میں فرق معلوم کیا جا سکتا ہے۔ بہت سی احادیث میں جو ہم تک پہنچی ہیں، نبی اکرم ﷺ نے ہمیں اس امکان سے خبردار کیا ہے کہ ان کے کلام میں اس طرح ملاوٹ کرنے کی کوشش ہوگی اور اس خطرہ سے نمٹنے کے لیے خود آپ ﷺ نے ایک سے زیادہ اصولوں کی نشاندہی کر دی ہے جن کے ذریعہ مسلمان 'درست' اور 'موضوع' احادیث (جو مخالفین اسلام اپنی ذاتی خواہشات کی تکمیل اور اسلام دشمنی کے لائحۂ عمل کو بروئے کار لانے کے لیے گھڑیں گے) میں آسانی سے فرق کر سکیں، آپ ﷺ نے فرمایا:

اگر تم لوگ کوئی حدیث سنو جو مجھ سے منسوب ہو اور تمہارا دل گواہی دے کہ یہ صحیح ہے، اور تم محسوس کرو کہ یہ تم سے (تمہارے تصورِ دین کے لحاظ سے) قریب ہے تو میں اس حدیث کو ماننے میں تم سے زیادہ تیار رہوں گا۔ دوسری طرف، اگر تم ایک حدیث سنو جو مجھ سے منسوب ہو مگر تمہارے قلوب اسے تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ ہوں اور تم اس حدیث کو (اپنے تصور دین کے لحاظ سے) اپنے آپ سے دور محسوس کرو تو لوگوں سے زیادہ میں دوری اختیار کروں گا۔[12]

یہ بات بھی ذہن میں رکھیئے کہ جب کسی حدیث کے (جو اصول حدیث کی بنا پر بالکل درست ہو) تین سلسلے یا بیانئے ہم تک پہنچیں تو کم از کم دو سلسلے یا بیانئے ایسے ضرور ہوں گے جن کے کچھ الفاظ راویان حدیث نے ایسے استعمال کر لیے ہوں جو من وعن حضور ﷺ نے استعمال نہیں فرمائے تھے، لیکن جن سے حدیث کے درست مطلب اور پیغام یا حکم میں کوئی ذرا

سی بھی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ الفاظ کے اس معمولی ردوبدل سے بہرحال حضور اکرم ﷺ کے لسانی اسلوب کو کوئی گزند نہیں پہنچتی۔

تراکیب اور اظہار بیان کی جدت

اب یہ کہنے کی تو کوئی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی کہ جب ہم قرآن کریم کی زبان کی تراکیب، اظہاریوں، اسالیب اور الفاظ و آیات کے آپسی تعلق کا مطالعہ کرتے ہیں تو اکثر اوقات ان تمام عناصر میں الگ الگ فرق کرنا خاصا مشکل ہوتا ہے۔ بہرحال اس ذیلی حصۂ مطالعہ میں ہم صرف تراکیب اور تعبیرات تک محدود رہنے کی کوشش کریں گے جو قرآنی طرزِ بیان کی تعمیر میں حصہ دار ہیں۔ یعنی ہم ایک ایک لفظ کے الگ کردار اور عبارت پر اس کے اثر کا مطالعہ نہیں کریں گے، نہ ہی ہم چار یا چار سے زیادہ الفاظ پر مشتمل لسانی اکائیوں کو فی الوقت مطالعہ میں شامل کریں گے۔ یہ اس لیے کہ اتنے طویل حصہ آیت میں تراکیب اور اظہاریئے موجود تو ہو سکتے ہیں لیکن اپنی طوالت کی وجہ سے اس حصہ کو زبان کے منطقۂ طرز (عربی مسبائک) میں رکھنا پڑتا ہے، جسے ہم نے مستثنیٰ کر دیا ہے۔ موجودہ بحث میں ہم اپنے آپ کو آیت کے دو یا تین الفاظ سے تعمیر شدہ کلمات تک محدود رکھیں گے جو کلمات قواعد یا تقریری لحاظ سے ایک ایسا نیا تعلق ہمارے سامنے لاتے ہیں جو قرآن کریم کے نازل ہونے سے پہلے عربی زبان میں ناپید تھا۔ ایک مسئلہ یہ بھی درپیش ہوتا ہے کہ تراکیب اور تعبیرات کی سرحدیں بعض اوقات اتنی غیر واضح ہوتی ہیں کہ انہیں الگ الگ شناخت کرنا مشکل ہوتا ہے۔ اس لیے موجودہ مطالعہ میں ''ترکیب'' کی تعریف میں یوں کروں گا کہ وہ تقریری بناوٹ جو ایک مکمل خیال آپ تک نہیں پہنچاتی اور جس میں بنیادی طور پر کلام کا ایک ذرّہ برابر حصہ (Particle) جیسے حروف عطف، حروف جر (Prepositions)، مجرد حروف وغیرہ ہوتے ہیں، جب کہ تعبیر کی تعریف یہ کروں گا کہ ایک ایسی تقریری بناوٹ جو آپ تک ایک مکمل یا تقریباً مکمل خیال پہنچاتی ہے اور جس میں بنیادی طور پر اسماء یا افعال ہوتے ہیں۔

قرآنی تراکیب

ایک انتہائی قلیل مدت میں بتدریج نازل ہوتے ہوتے مکمل ہونے تک جسے تقریباً یکمشت ہی سمجھئے، قرآن کریم نے عربوں کو ہزاروں نئی تراکیب اور تعبیرات دے ڈالیں۔ ان تراکیب اور تعبیرات سے قرآن کی سورتیں بھری پڑی ہیں۔ یہ اتنی مقبول ہوئیں کہ ادبی تخلیقات اور ورزمرہ کی گفتگو میں یکساں طور پر داخل ہوگئیں اگرچہ کہ ان کی اکثریت اپنی منفرد قرآنی شناخت کی وجہ سے عربی کی دوسری تحریری یا تقریری اصناف سخن میں داخل کرنے سے مستثنیٰ کردی گئی تھی۔

قرآن کی تلاوت کرتے وقت ہمیں بے شمار قرآنی تراکیب سے واسطہ پڑتا ہے۔ پھر بھی نہ تو ہم ان پر غور کرنے کے لیے ٹھہرتے ہیں اور نہ ہی ہمیں ان میں کوئی غیر معمولی یا تذبذب میں مبتلا کرنے والی کوئی بات نظر آتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم قرآن سے اتنا مانوس ہو چکے ہیں کہ اصل میں یہ غیر معمولی طرز ہمیں عین متوقع محسوس ہوتا ہے۔ لیکن اگر ہم ان تراکیب پر گہرائی سے طویل وقت تک غور کریں اور اپنی یادداشت سے قرآنی زبان کی واقفیت کو کچھ عرصہ کے لیے کھرچ کر، اپنی روزمرہ کی تمام تحریری یا تقریری زبان تک محدود ہو جائیں تو ہم اچانک ایک ایسی نئی زبان سے دوچار ہوتے ہیں جو ہماری روزمرہ زبان کی صرف ونحو کے اصولوں پر قائم ہونے کے باوجود ہماری روزمرہ کی انسانی عربی زبان سے قطعاً کوئی تعلق نہیں رکھتی۔

تختی 1: قرآنی نئی تراکیب بمقابلہ عام عربی تراکیب

قرآنی ترکیب	عام عربی زبان کی ترکیب	اردو ترجمہ
مَن ذَا الَّذِی	مَن الَّذِی	کون ہے وہ....؟
هَل عَسَيتُم	هَل يَنتَظِرُوا مِنكُم	شاید کہ تم ایسا کرتے.....؟
فَاذ لَم يَأتُوا	فَمَا هُوَ عَاجِزِينَ أن يَأتُوا	اگر وہ نہیں سکے...

بَعدَ اِذ	بَعدَ أن	بعد میں...
وَ کَذٰلِکَ جَعَلنَا	وَھٰکَذَا جَعَلنَا	اسی طرح ہم نے بنایا...
وَاِن کُلُّ لَّمَّا	وَکُلُّ وَاحِدٍ مِّنھُم	ان میں سے ہر ایک
اِن کَادَ لَیُضِلُّونَ	کَادَ أن یُّضِلّنَا	اس نے ہمیں تقریباً گمراہ کر دیا
أوَ لَو جِئتُکَ	حَتّٰی اَن جِئتُکَ	اگر میں تمہارے پاس لے بھی آؤں
فَلَمَّا اَن جَاءَ	فَلَمَّا جَاءَ	جب وہ آ گیا
اِنَّا لَنَحنُ الغَالِبُون	اِنَّا سَنَغلِبُونَ	ہم ان پر غالب آ جائیں گے
فِیمَا ھٰھُنَا آمِنِین	آمِنِین ھُنَا	(تم سب) یہاں محفوظ ہو
قَلِیلًا مَّا	مَا أقَلُّ	بہت کم، شاذ و نادر

اوپر دی ہوئی فہرست پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے سے ہی معلوم ہو جائے گا کہ قرآن میں بار بار وارد ہونے والی تراکیب اور روزمرہ کی عام عربی زبان میں استعمال ہونے والی تراکیب میں کس قدر فرق ہے۔

اگر کوئی پوچھے کہ اس سورۃ میں کتنی نئی تعبیرات ہیں تو بہتر سوال یہ ہوگا کہ اس سورۃ میں کون سی تعبیر نئی نہیں ہے؟ ''سورۃ المدثر'' میں 56 آیات ہیں جو دو صفحات سے بھی کم میں سمائی ہوئی ہیں۔ اس اختصار کے باوجود اس میں کم از کم 65 نئی قرآنی تعبیرات اور 12 نئی تراکیب شمار کی جا سکتی ہیں جو محض 56 آیات میں سمٹ آئی ہیں۔ ان میں سے بھی کم از کم 30 آیات صرف دو یا تین الفاظ پر مشتمل ہیں اس سے صاف مطلب نکلتا ہے کہ اس سورۃ میں بمشکل کوئی ایسی تعبیر ہے جس سے قرآن کے نزول کے وقت موجود عرب پہلے سے واقف تھے۔ اس سے بھی زیادہ غیر معمولی اور حیرت انگیز یہ حقیقت ہے کہ کل 65 میں سے 52 نئی تعبیرات اس سورۃ کے علاوہ قرآن میں کہیں نہیں ہیں۔ اس مشاہدہ سے ایک مرتبہ پھر یہ یقین حاصل ہوتا ہے کہ قرآن کی زبان ہی نئی نہیں ہے بلکہ یہ حقیقت بھی ثابت ہوتی ہے کہ قرآن کی ہر سورۃ کی اپنی ایک لسانی

شخصیت ہے جو اسی سورۃ کے ساتھ مخصوص ہے۔ اس قسم کی صورت حال سے مختصر سورتوں کے مطالعہ کے وقت ہم بار بار دوچار ہوں گے۔ یہ مطالعہ کتاب کی دوسری جلد میں شامل کیا جائے گا جو فی الوقت تیار نہیں ہے۔

تختی 2: سورۃ مدثر کی 12 نئی تراکیب

ترکیب	اردو ترجمہ	آیت
فَذَالِکَ یَومِ الدِّینِ	یہ وہی دن ہوگا...	9
کَلَّا اِنَّهُ	ہرگز نہیں، وہ (یہ) ہے...	16
فَقُتِلَ کَیفَ	اور اس (طرزِ عمل کی وجہ سے) وہ ہلاک ہو جائے	19
ثُمَّ قُتِلَ کَیفَ	ہاں پھر وہ (اس طرز عمل کی وجہ سے) ہلاک ہو جائے[13]	20
اِنْ هٰذَا اِلَّا	یہ سب کچھ نہیں ہے بلکہ محض...	24
وَمَا أَدْرَاکَ مَا	اور تم کیا جانو کہ کیا ہے...	27
کَذٰلِکَ یُضِلُّ	اسی طرح وہ (اللہ تعالیٰ) گمراہ کرتا ہے...	31
کَلَّا وَالْقَمَرِ	نہیں، ہرگز نہیں، چاند کی قسم...	32
لَم نَکُ مِن	ہم ان میں سے نہیں...	43
فَمَا لَهُم عَن	پھر انہیں کیا ہوا کہ...	49
کَلَّا بَلْ لَا	ہرگز نہیں، بلکہ وہ... نہیں	53
اِلَّا أَنْ یَشَاءَ اللّٰهُ	سوائے اس کے کہ اللہ (ہی) چاہے	56

تختی 3: سورہ مدثر میں 65 نئی تعبیرات

نمبر	تعبیر (مظہر)	اردو ترجمہ	آیت
1	يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ	''اے چادر اوڑھنے والے (حبیب)''	1
2	قُمْ فَأَنذِرْ	''اٹھیں اور (لوگوں کو اللہ کا) ڈر سنائیں''	2
3	وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ	''اور اپنے رب کی بڑائی (اور عظمت) بیان فرمائیں''	3
4	وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ	''اور اپنے (ظاہر و باطن کے) لباس پاک رکھیں''	4
5	وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ	''اور (حسب سابق گناہوں اور) بتوں سے الگ رہیں''	5
6	وَلَا تَمْنُن تَسْتَكْثِرُ	''اور (اس غرض سے کسی پر) احسان نہ کریں کہ زیادہ کے طالب ہوں''	6
7	وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ	''اور آپ اپنے رب کے لیے صبر کیا کریں''	7
8	فَإِذَا نُقِرَ فِي النَّاقُورِ	پھر جب (دوبارہ) صور میں پھونک ماری جائے گی''	8
9	فَذَلِكَ يَوْمَئِذٍ يَوْمٌ عَسِيرٌ	''سو وہ دن (روز قیامت) بڑا ہی سخت دن ہوگا''	9
10	عَلَى الْكَافِرِينَ غَيْرُ يَسِيرٍ	''کافروں پر ہرگز آسان نہ ہوگا''	10
11	ذَرْنِي وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيداً	''آپ مجھے اور (اس شخص کو جسے میں نے اکیلا پیدا کیا) بدلہ لینے کے لیے چھوڑ دیں''	11
12	وَجَعَلْتُ لَهُ مَالاً	''اور میں نے اسے مال دیا تھا''	12
13	مَالاً مَّمْدُوداً	''بہت وسیع مال''	12

14	وَبَنِيْنَ شُهُوداً	''(اس کے سامنے) حاضر رہنے والے بیٹے (عطا کیے) تھے''	13
15	وَمَهَّدتُّ لَهُ تَمْهِيْداً	''میں نے اسے (سامانِ عیش وعشرت) میں خوب وسعت دی تھی''	14
16	يَطْمَعُ أَنْ أَزِيْدَ	''وہ حرص رکھتا ہے کہ میں اور زیادہ کروں''	15
17	كَانَ لِآيَاتِنَا عَنِيْداً	''وہ ہماری آیتوں کا دشمن رہا ہے''	16
18	سَأُرْهِقُهُ صَعُوداً	''عنقریب میں اسے سخت مشقت (کے عذاب) کی تکلیف دوں گا''	17
19	فَكَّرَ وَقَدَّرَ	''اس نے سوچ بچار کیا اور (دل میں) ایک تجویز مقرر کر لی''	18
20	فَقُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ	پس اس پر (اللہ کی) مار ہو، اس نے کیسی تجویز کی''	19
21	عَبَسَ وَبَسَرَ	''پھر تیوری چڑھائی اور منھ بگاڑا''	22
22	أَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ	''(حق سے) پیٹھ پھیر لی اور تکبر کیا''	23
23	سِحْرٌ يُؤْثَرُ	''جادوئی کلام (قرآن) جو (پہلے زمانہ سے) نقل ہوتا آیا ہے''	24
24	سَأُصْلِيْهِ سَقَرَ	''میں عنقریب اسے دوزخ میں جھونک دوں گا''	26
25	لَا تُبْقِيْ وَلَا تَذَرُ	''وہ (ایسی آگ ہے جو) نہ باقی رکھتی ہے اور نہ چھوڑتی ہے''	28
26	لَوَّاحَةٌ لِّلْبَشَرِ	''(وہ) جسمانی کھال کو جھلسا کر سیاہ کر دینے والی ہے''	29
27	أَصْحَابَ النَّارِ	''آگ (دوزخ) کے داروغے''	31
28	وَمَا جَعَلْنَا عِدَّتَهُمْ	''ہم نے ان کی تعداد مقرر نہیں کی ہے''	31

29	فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوا	''ان کافروں کے لیے ایک آزمائش''	31
30	الَّذِيْنَ أُوتُوا الْكِتَابَ	''وہ جنہیں پہلے زمانہ میں کتاب دی گئی تھی''	31
31	يَـزْدَادَ الَّـذِيْـنَ آمَنُوا إِيْمَاناً	''ایمان والوں کا ایمان (اس میں) اور بڑھ جائے''	31
32	فِيْ قُلُوبِهِم مَّرَضٌ	''جن کے دلوں میں (نفاق کی) بیماری ہے''	31
33	مَاذَا أَرَادَ اللَّهُ بِهَذَا مَثَلاً	اس (تعداد کی) مثال سے اللہ کی مراد کیا ہے؟''	31
34	يُضِلُّ اللَّهُ مَن يَشَاءُ	''اللہ جسے چاہتا ہے گمراہ ٹھہراتا ہے''	31
35	وَيَهْدِيْ مَن يَشَاءُ	''اور جسے چاہتا ہے ہدایت فرماتا ہے''	31
36	جُنُودَ رَبِّكَ	''آپ کے رب کے لشکر''	31
37	ذِكْرَى لِلْبَشَرِ	''انسان کی نصیحت کے لیے''	31
38	كَلَّا وَالْقَمَرِ	''ہرگز نہیں، چاند کی قسم''	32
39	وَاللَّيْلِ إِذْ أَدْبَرَ	''اور رات کی قسم جب وہ پیٹھ پھیر کر رخصت ہونے لگے''	33
40	وَالصُّبْحِ إِذَا أَسْفَرَ	''اور صبح کی قسم جب وہ روشن ہو جائے''	34
41	لَإِحْدَى الْكُبَرِ	''بہت بڑی آفتوں میں سے ایک ہے''	35
42	نَذِيْراً لِّلْبَشَرِ	''انسان کو ڈرانے والی ہے''	36
43	أَن يَتَقَدَّمَ أَوْ يَتَأَخَّرَ	''جو (نیکی میں) آگے بڑھنا چاہے یا پیچھے (بدی میں) رہ جائے''	37
44	بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ	''ان (اعمال) کے بدلے میں جو اس نے کیے ہیں گروی ہے''	38
45	أَصْحَابَ الْيَمِيْنِ	''دائیں جانب والے''	39

46	فِیْ جَنّٰتٍ یَتَسَاءلُونَ	''(وہ) باغات میں ہوں گے اور آپس میں پوچھتے ہوں گے''	40
47	یَتَسَاءلُونَ عَنِ الْمُجْرِمِیْنَ	''مجرموں کے بارے میں پوچھتے ہوں گے''	40 41
48	مَا سَلَکَکُمْ فِیْ سَقَرَ	''تمہیں کیا چیز دوزخ میں لے گئی''	42
49	لَمْ نَکُ مِنَ الْمُصَلِّیْنَ	''ہم نماز پڑھنے والوں میں نہ تھے''	43
50	وَلَمْ نَکُ نُطْعِمُ الْمِسْکِیْنَ	''اور ہم محتاجوں کو کھانا نہیں کھلاتے تھے''	44
51	نَخُوضُ مَعَ الْخَائِضِیْنَ	''ہم بیہودہ (گناہ گاروں) کے ساتھ مل کر گناہ کے کاموں میں پڑے رہتے تھے''	45
52	یَوْمِ الدِّیْنِ	''روز جزا''	46
53	نُکَذِّبُ بِیَوْمِ الدِّیْنِ	''ہم روز جزا کو جھٹلایا کرتے تھے''	46
54	أَتَانَا الْیَقِیْنُ	''یہاں تک کہ ہم تک جس کا آنا یقینی تھا (موت) آپہنچی''	47
55	شَفَاعَةُ الشَّافِعِیْنَ	''شفاعت کرنے والوں کی شفاعت''	48
56	عَنِ التَّذْکِرَةِ مُعْرِضِیْنَ	''نصیحت سے روگردانی کیے ہوئے ہیں''	49
57	حُمُرٌ مُّسْتَنفِرَةٌ	''بدکے ہوئے (وحشی) گدھے ہیں''	50
58	فَرَّتْ مِن قَسْوَرَةٍ	''جو شیر سے بھاگ کھڑے ہوئے ہیں''	51
59	یُؤْتَی صُحُفاً مُّنَشَّرَةً	''کھلے ہوئے (آسمانی) صحیفے دے دیئے جائیں''	52
60	لَا یَخَافُونَ الْآخِرَةَ	''وہ لوگ آخرت سے ڈرتے ہی نہیں''	53

61	إِنَّهُ تَذْكِرَةٌ	''کچھ شک نہیں کہ یہ (قرآن) نصیحت ہے''	54
62	فَمَن شَاء ذَكَرَهُ	''پس جو چاہے اسے یاد رکھے''	55
63	يَشَاءَ اللَّهُ	''اللہ چاہے گا''	56
64	أَهْلُ التَّقْوَى	''تقویٰ (پرہیزگاری) کا مستحق ہے''	56
65	أَهْلُ الْمَغْفِرَةِ	''مغفرت کا مالک ہے''	56

اوپر درج شدہ تعبیرات میں سے صرف دو کو استثنیٰ حاصل ہے کہ وہ بعد میں بھی غیر قرآنی ادبی عربی اور روزمرہ کی عربی میں بھی استعمال ہوتی رہیں۔ ان میں سے ایک 'لَا تُبْقِي وَلَا تَذَرُ' جو 28ویں آیت میں آئی ہے اور دوسری 'يَشَاءَ اللّٰهُ' جو 56ویں آیت میں آئی ہے، باقی تمام تعبیرات صرف قرآن میں استعمال تک محدود رہی ہیں۔

انفرادی الفاظ اور جدت وسلاست کی آمیزش کا معجزہ

قرآن کریم نئے الفاظ سے بھرا پڑا ہے اور اسی حقیقت نے بعض تنگ نظر مغربی ناقدین کو یہ کہنے پر اکسایا ہے کہ قرآن اصل عربی زبان میں نہیں ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہر نئی چیز کو شک کی نظر سے دیکھنے والے ان لوگوں کی نظر سے یہ خاص نقطہ اوجھل رہا کہ خود قرآن، ایک سے زیادہ مقامات پر اپنی زبان کے بارے میں اعلان کرتا ہے کہ ''بلسان عربی مبین'' (اس کا نزول) فصیح عربی زبان میں (ہوا) ہے۔ (13) (شعراء 26:195) اس نظریہ کی انتہا پسندی کا حالیہ حامی ایک جرمن مستشرق کرسٹوف لکز نبرگ (Christoph Luxenberg) ہے جو اپنی کتاب The Syro-Aramaic Reading of the Koran میں (مطبع جرمنی 2000) دعویٰ کرتا ہے کہ قرآن محمد ﷺ نے (نعوذ باللہ، مترجم) خود گھڑ لیا تھا جس کا ماخذ عیسائی مذہب کی کتابوں کے متن (بیانات) تھے۔ اس سے پہلے بھی دوسرے مستشرقین اور ایونجلسٹ (Evangelist) فرقے کے عیسائی متواتر اس نظریہ کو پھیلانے کی کوشش کرتے رہے ہیں کہ قرآن کا ماخذ عیسائی تعلیمات ہیں، لکز نبرگ کے بیان

کے مطابق قرآن کی زبان عربی نہیں بلکہ شامی، آرمینیائی زبان ہے جو ان شامی تاجروں کی زبان تھی جو تجارت کے سلسلہ میں اکثر و بیشتر مکہ آیا کرتے تھے اور مقامی لوگوں سے ان کا کافی ملنا جلنا رہتا تھا۔ لکزمبرگ اس ''صداقت'' کو منوانے میں اس حد تک چلے جاتے ہیں کہ یہ فرمانے سے بھی نہیں چوکتے کہ شامی آرمینیائی زبان میں قرآنی آیات کے معنی ان معنی سے قطعی مختلف ہیں جو مسلمان مفسرین قرآن نے بیان فرمائے ہیں۔[14]

اب یہ کہنے کی تو ضرورت ہی باقی نہیں رہتی کہ لکزنبرگ صاحب کے اس نظریہ کی، کہ قرآنی زبان کا منبع و مآخذ شامی، آرمینیائی زبان ہے، تقریباً تمام مسلم اور غیر مسلم علماء نے بھی شدت سے مخالفت کی ہے، سوائے چند بددیانت لوگوں کے جو اس قسم کے جھوٹے الزامات کی تشہیر میں ہمیشہ پیش پیش رہتے ہیں۔

حقیقت تو یہ ہے کہ لکزنبرگ صاحب کے دعویٰ کے بالکل برخلاف، قرآن میں وارد ہونے والے بالکل نئے الفاظ جن صورتوں اور اشکال میں آئے ہیں، وہ ان تمام اصولوں کی پاسداری کرتے ہیں جو عربی زبان اور اس کے قواعد کی روح ہیں۔ شاید ہی کوئی قرآنی اصطلاح ہو جو ان اصولوں سے منحرف ہو۔ مزید براں، قرآن کے متعارف شدہ نئے الفاظ ایسے لسانی پس منظر کے ساتھ آتے ہیں کہ قاری کو ان کے نئے پن کے باوجود معنی سمجھنے میں دقت نہیں ہوتی۔ اس طرح جدت اور فصاحت کی اس آمیزش سے وہ اختراعی معجزہ ظہور پذیر ہوتا ہے جو قرآنی زبان کا خاصہ ہے۔

قرآن میں پائی جانے والی نئی اصطلاحات کی اہمیت

کسی بھی عرب شاعر یا ادیب کے لیے یہ ایک بڑے اعزاز کی بات تھی کہ وہ کوئی نئی اصطلاح ایجاد کر کے ادب سے روشناس کرادے۔ یہ بات خاص طور سے اس وقت اور زیادہ اہمیت کی حامل ہوتی جب وہ نئی اصطلاح لوگوں کے دل و دماغ پر اس طرح چھا جائے کہ عام لوگ اسے روز مرہ کی بول چال میں اکثر استعمال کرنے لگیں اور دوسرے شعراء و ادباء اپنی تخلیقات میں اسے جگہ دینے لگیں۔ بعض مرتبہ نیا لفظ اس قدر طاقتور اثر رکھتا تھا کہ اگر وہ کسی شاعر کے کلام میں صرف ایک مرتبہ ہی نمودار ہو جائے تو دوسرے لوگ شاعر کو اس کے اصل نام کے

بجائے اس نئے لفظ سے ہی جاننے لگتے تھے۔ مثال کے طور پر قبل اسلام عربی ادب میں ایک شاعر **النابغة الذبیانی** (604ء) کو یہ نام اس کے ایک مصرعہ **فقد نبغت لنا منهم شوؤنٌ** کی وجہ سے **المرقش الاکبر** کو مصرعہ 'رقش فی ظهر الأدیم قلم' کی وجہ سے اور **المسیب بن علس** (575ء) کو اس کے قول **غزاراً فقولوا للمسیب یلحق** کی بنا پر ملا۔

جب ہم قرآن کریم کی زبان کا تحقیقی مطالعہ شروع کریں تو چند حقائق ہمارے ذہن میں ہونے چاہئیں، خاص طور پر نئی اصطلاحات کے حوالہ سے تو اور بھی زیادہ! کسی چھوٹے سے بچہ کو بھی حروفِ تہجی کے 29 حروف دے کر نئے الفاظ بنانے کو کہا جائے تو وہ ان حروف کو مختلف طریقوں سے ملا ملا کر لاکھوں نئے الفاظ بنا سکتا ہے۔ مگر اہم سوالات یہ پیدا ہوں گے کہ: یہ نئے الفاظ کسی کی سمجھ میں آئیں گے اور ان کی علمی و ادبی حیثیت کیا ہوگی؟ یہی وہ مقام ہے جہاں قرآنی معجزہ کی حقیقت سب سے زیادہ واضح طور پر نمایاں ہوتی ہے۔ ساتویں صدی کے صحرائی بدو قرآنی جدید زبان کو پہلے تو تعارف کے ساتھ ہی سمجھنے لگے تھے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ قرآن ایک ایسی زبان لایا تھا جو اپنے بنیادی عناصر اور جہتوں، اپنے الفاظ، لسانی اجزاء، اسماء اور افعال، اپنی تراکیب، تمثیلات (امیجز) اور طرزوں، الفاظ کے باہمی رابطوں، گرامر کے نئے ضابطوں، نئے تصورات اور لسانی قوانین، اس کی تاریخی کارکردگی کے بیانات اور اس کے خالص علمی حقائق کے اعتبار سے نئی تھی۔ ایک کمال کی بات یہ بھی ہوئی کہ بدو سامعین نہ صرف اس زبان کو سمجھے بلکہ اس نئی، عجیب و غریب زبان پر ان کا تحسین و توصیف کا ردعمل اتنا شدید تھا کہ اس کی سرحدیں ''مبہوتیت'' تک جا پہنچیں۔ اس نئی زبان کی برتری اور اس کے اعلیٰ ادبی مقام تک پہنچنے سے لاچاری کا اعتراف نہ صرف مسلمانوں نے، بلکہ غیر مسلم ناقدین اسلام نے بھی فوراً ہی کیا۔

نئی قرآنی اصطلاحات مندرجہ ذیل پانچ اقسام الفاظ کے مجموعوں میں سے کسی ایک میں شامل کی جاسکتی ہیں:

1۔ الفاظ کی وہ قسم جس سے اہل عرب پہلے سے واقف تھے، لیکن قرآن نے انہیں نئے مطالب کا جامہ پہنایا۔ یہ نئے معنی ان الفاظ کے اس تحریری یا قولی حوالہ سے سمجھے جاسکتے تھے جس حوالہ سے قرآن میں وارد ہوئے تھے۔ ان الفاظ کی چند مثالیں یہ ہیں:

سُلْطَانٌ (اقتدارِاعلیٰ)، مَرَضٌ (بیماری جو 'کفر' کے استعارہ کے طور پر استعمال ہوا)، تَوَلّٰی (پیٹھ پھیر لینا، روگردانی کرنا، پلٹ جانا یعنی اسلام قبول نہ کرنے کے معنی میں)، اَسْلَمَ (اللہ تعالیٰ کو مان کر سرِ تسلیم خم کر دینا)، اَلدُّنْیَا (دنیاوی زندگی، دنیاوی عیش)، اَلصَّالِحَاتُ (اچھے کام، نیک کام)، اَلشُّھَدَاءُ (اللہ تعالیٰ کی راہ میں جان دینے والے)، اَلرُّوْحُ (روح یعنی حضرت جبرئیل علیہ السلام جو ایک فرشتہ ہیں)، خَاشِعِیْنَ (عاجز، یا باادب)، نَبْتَھِلْ (اللہ تعالیٰ سے دعا مانگنا، درخواست پیش کرنا)، أَصَرَّ (وزن، بوجھ، حرام اور ممنوع کا ہم معنی)، کِتَابٌ (الہامی، آسمانی صحیفہ)، اَلْبَیِّنَةُ (ثبوت، دلیل، اسلام میں وحی کا متبادل بھی)، اَلْبِرُّ (نیکی، پاکبازی)، عِوَجٌ (کجی، ٹیڑھا پن)، اَلْحِرْثُ (کھیتی، زمین جوتنا، بیوی کے لیے قرآنی لفظ)، یَنْظُرُوْنَ (غور کرنا، فیصلہ کرنا)، یَسْطُوْنَ (حملہ کرنا، مجرمانہ حملہ)، اَلْمُھْتَدُوْنَ (ہدایت یافتہ، اہل ایمان کے لیے ایک استعارہ)، اَلْبُرُوج (مینارے، ایک واضح شکل میں مرتب کئی ستاروں کا ایک مجموعہ جو 'برج' کہلاتا ہے۔ بروج اس کی جمع ہے)، اَلْقَدْرُ (تقدیر)، یَقْدِرُ (پہلے سے طے شدہ امر)۔

2۔ وہ الفاظ جو اپنی ابتدا اور لسانی ارتقاء کی تاریخ کے اعتبار سے تو جدید تھے لیکن وہ ان لسانی بنیادوں پر ہی بنائے گئے تھے جن سے اس زمانہ کے عرب لوگ خوب واقف تھے۔ الفاظ کی یہ قسم جس زمرہ میں آتی ہے وہ پہلی بیان کی ہوئی قسم سے زیادہ طویل فہرست کی حامل ہے۔ اس میں مثال کے طور پر یہ الفاظ شامل ہیں: آتَاهُ (اس دینے والے نے اسے دیا)، مَلَکُوت (بادشاہت، اقتدار اعلیٰ)، طَاغُوت (بدی کی طاقتیں)، اَلْجَاهِلِیَّةُ (جہالت کا زمانہ یعنی زمانۂ قبل اسلام)، صَلَوَاتٌ (مساجد، عبادت گاہیں)، هَادُوا (یہودی عقیدہ والے)، مَقَامِعٌ (پکڑ، سخت گرفت)، اَلْفُرْقَانُ (سچ اور جھوٹ میں واضح فرق کر دینے والا، امتیاز قائم کر دینے والا)، اَلرَّقِیْمُ (تاریخی یا مذہبی تحریر والا کتبہ)، مَرْقُومٌ (تحریر شدہ دفتر یا رجسٹر)، اَلْمِحْرَابُ (گوشہ، کوٹھری)، اَلْقِصَصُ (قصے، کہانیاں)، غُزَی (لڑائی)،

حَظِیرَہ (بھیڑوں کا باڑا)، اَلاَنْعَامُ (مویشی)، دَحَاھَا (اس زمین کو لپیٹ دیا)، سِحرٌ (جنون، پاگل پن)، تَزَاوَرٌ (کنارہ کشی کرنا، پہلو بچانا)، مُلتَحِدٌ (پناہ)، اَلعَادُونُ (حد سے گزر جانے والے، سرکش)، رَبَّانِیُّونَ (درویش، اللہ والے لوگ)، قَانِتُونَ (فرماں بردار)، اَلمُنَافِقُونَ (منافقت کرنے والے)، عِلِّیُّونَ (اعلیٰ درجہ والے)، شَکُورٌ (انتہائی شکر گزار ہونا (کسی انسان کا) اللہ تعالیٰ کے کرم کا فوری اور دل سے شکر گزار ہونا)، الشُّوریٰ (بدی، برائی)، اَلسَّلْسَبِیْلُ (جنت میں ایک پانی کا چشمہ)، تِلْقَاءٌ (کسی کی طرف، کسی جانب)، وَاعَدنَا (طے شدہ، وفا کر دینا).....۔

3۔ وہ الفاظ جو شروع میں جدیدیت کے مرحلہ سے گزرے لیکن رفتہ رفتہ روزمرہ کی زندگی میں استعمال ہونے والے اور زیادہ بلاغت کے حامل مرحلہ میں داخل ہو گئے۔ یہ دوسرا مرحلہ زیادہ مستحکم اور وسیع الاستعمال تھا۔ اپنے استعمال کی اکثر صورتوں میں یہ الفاظ ایک ایسی تکنیکی اصطلاح میں ڈھل گئے جہاں یہ اپنی قوت اظہار اور معنی آفرینی میں اصل اصطلاح کے دائرہ سے بھی تجاوز کر گئے۔ مثلاً: مُؤمِنٌ (ایمان والا)، کَافِرٌ (نہ ماننے والا، انکار کرنے والا)، اَلذِّکرُ (یاددہانی، اسلامی وحی یا صحیفہ)، (مساجد (عبادت گاہیں، لغوی اعتبار سے سجدہ کرنے کی جگہ)، اَلسَّاعَۃُ (قیامت کا دن، لغوی معنیٰ گھڑی یا وقت)، أَجرٌ (بدلہ، خاص طور پر آخرت میں)، اَلتَّقْویٰ (خوف خدا، یہ احساس کہ خدا دیکھ رہا ہے)، حَسَنَۃٌ (نیکی، لغوی معنی کوئی خوبصورتی کی حامل شے)، سَیِّئَۃٌ (بدی، برا کام)، نکاح (شادی)، اَلغَیبُ (نظر نہ آنے والی دنیا یا نظم اقتدار)، اَلشَّھَادَۃُ (محسوس ہو جانے والی دنیا جس کا حسیات سے ادراک ہو جائے)، اَلصَّلاۃُ (باقاعدہ نماز)، اَلزَّکوٰۃُ (مال کو پاک کر دینے والی خیرات)، اَلاِیْمَانُ (عقیدہ، پکا یقین)، اَلجِھَادُ (سخت کوشش، جدوجہد)، اَلشِّرکُ (ایک اللہ کی الوہیت کے ساتھ دوسرے خداؤں کو بھی شریک ماننا)، اَلآخِرَۃُ (موت کے بعد دوبارہ زندگی)، اَلقِیَامَۃُ (قیامت یعنی دوبارہ جی اٹھنے والا دن)، اَلنَّارُ (جہنم کی آگ)۔

4۔ وہ الفاظ جو یا تو تھے ہی نہیں، یا متروک ہو چکے تھے، اور عربی بولنے والوں کے لیے ان کی لسانی اثاث غیر معروف تھی، لیکن قرآن نے ان الفاظ کو اس طرح معلوم حوالوں کی روشنی میں استعمال کیا کہ سامعین یا قارئین کو ان کا مطلب اخذ کرنے میں چنداں دشواری نہیں ہوئی۔ اس قسم میں شامل الفاظ کی اکثریت کو دوسری زبانوں کے الفاظ سے، معرب کر کے بنایا گیا ہے، جن میں خاص طور پر فارسی، یونانی، حبشی، شامی، عبرانی اور قبطی زبانیں شامل ہیں۔ مثال کے طور پر صِرَاطٌ (سیدھا راستہ)، سُبْحَانَکَ (پاک ہے آپ کی ذات والا شان (اے اللہ)، أَبٌّ (گھاس)، قَصْوَرَةٌ (شیر)، سِجِّينٌ (ناقابل فرار جیل خانہ)، بَرْزَخٌ (رکاوٹ، دو مقامات کے درمیان کی جگہ)، سِجِلٌّ (حساب کا دفتر یعنی رجسٹر)، سِجِّيْلٌ (پکی ہوئی سخت مٹی اور پتھر)، اَلتَّنُّوْرُ (مٹی کا تندور جسے اردو میں تنور بھی لکھا جاتا ہے)، ضِيْزَةٌ (ناانصافی)، قَمْطَرِيْرٌ (تکلیف دہ، غصہ سے بھری)، سُنْدُس (باریک ریشم)، إِسْتَبْرَقٌ (موٹی ریشم جسے اردو میں بھی ''بروکیڈ'' عام طور پر بولتے اور سمجھتے ہیں)، اَبَارِيقٌ (لوٹے، کھلے منہ والے آبخورے)، اَلقِسطُ (انصاف، برابری)، اَلقِسطَاسُ (پورا بھرا ہوا پیمانہ)، اَلفِردَوسُ (جنت)، مِشْكَاةٌ (چراغ رکھنے کی طاق)، طُوبىٰ (خوشی، خوشحالی)، قَرَاطِيْسٌ (قرطاس کی جمع، کاغذ)، سَرَادِقُ (خیمے، بیٹھکیں)، أَلّ (معاہدہ، خونی رشتے)، كُرْسِيٌّ (کرسی، تخت اقتدار)، اَلأَرَائِكُ (مسندیں، آرام دہ مسہریاں)، جُبتٌ (گڑھا، خندق)، يَمٌّ (کھلا سمندر)، اَلطُّورُ (کوہ طور)۔

5۔ وہ الفاظ جن کے علاماتی اور استعاراتی مفہوم سے فائدہ اٹھاتے ہوئے قرآن نے انہیں استعمال کیا اور الفاظ کو جدت بخشی۔ درحقیقت دنیا کی مختلف زبانوں کے الفاظ کی اکثریت اسی طرح وجود میں آئی ہے۔ قرآن نے عربی زبان کو اس قسم کے سیکڑوں الفاظ سے مالا مال کیا، جن کے استعاراتی معنی سے اہل عرب ناواقف تھے۔ ان الفاظ کی مثالیں یہ ہیں: اَلسَّلَامُ (سپردگی)، كفر (چھپانا، حق کو نا مان کر)، يَتَزَكّىٰ (ایمان قبول کر کے نفس کو پاک کرنا)، سِدْرَةٌ (بیری کا درخت)، اَلمِيْزَانُ (ترازو

(جس میں قیامت کے دن اعمال تولے جائیں گے)، حَـــرَثٌ (زمین جوتنا، بیوی سے راشتۂ ازدواج قائم کرنا تاکہ ''بچوں'' کی کھیتی حاصل ہو)، اَلهُـــدیٰ (ہدایت (سچے، سیدھے راستہ کی طرف)، اَلـضَّلَالَةُ (گمراہی، راستہ بھٹک جانا، اسلام سے ہٹ جانا)، اَلتَّـقْـوٰی (اللہ تعالیٰ سے ڈرنا، خطرات سے ہوشیار رہنا، مستقل مزاجی سے نیکیاں کر کے اللہ تعالیٰ کے غصہ سے بچنے کی کوشش کرنا جو گناہوں کی وجہ سے سزا کی صورت میں نازل ہوسکتا ہے)، اَلْأُمَّةُ (ایک قوم، ایک ملت جو اس وقت خاص طور پر مسلم قوم کے حوالہ سے استعمال ہوتا ہے)، لِبَـاسٌ (اردو میں بھی یہی لفظ پہننے کے کپڑوں کے لیے مستعمل ہے، استعاراتی زبان میں ایک دوسرے کی خامیوں اور کمزوریوں کو پوشیدہ رکھنے والی چیز، پردہ پوشی)، مُـحْـصَـنَـاتٌ (شریف زادیاں، عفیف عورتیں، لفظی معنی کے اعتبار سے غیر مردوں کے لیے ناقابل پہنچ خواتین)، آيَةٌ (نشانی معجزہ؛ قرآنی آیات کے لیے استعمال ہونے والا لفظ جو اردو میں بھی آیت ہے)، اَلْأَوَّابُ (پلٹنے والا، اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی وہ صفت بیان کرتا ہے کہ جب بندہ گناہوں کا اقرار کر کے اس کی بارگاہ میں معافی کی درخواست کرتا ہے تو وہ بندہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اسے معاف فرما دیتا ہے)، اَلْأَجَـلُ (مقررہ وقت، موت)، وَازِرَةٌ (بوجھ اٹھانے والا، روح انسانی)، اَلـحَافِرَةُ (زمین، میدان)، اَلسَّـاهِرَةُ (پوری طرح بیداری کی حالت) اور اَلْخُنَّسُ (پوشیدہ یا آنکھوں سے اوجھل ستارے)۔

قارئین واضح طور پر دیکھ سکتے ہیں کہ ہم نے قرآنی زبان کے اعجاز کو ثابت کرنے کے لیے سراسر نئے الفاظ کی تعداد پر ہی انحصار نہیں کیا ہے۔ یہ بات اس حقیقت سے بھی آشکارا ہوتی ہے کہ سورۃ فاتحہ میں 58 لسانی رجحانات کی شناخت ہو جانے کے باوجود ان میں صرف پانچ الفاظ نئے ہیں جو یہ ہیں: اَلرَّحْمٰنُ، اَلْأَمِيْنُ، اَلدِّيْنُ (''قیامت کا دن'' کے معنی میں)، الصراط، اور الضالین۔

جس طرح قرآن کے اپنے اسالیب بیان، تراکیب اور منفرد لسانی رابطے ہیں بالکل اسی طرح اس کے یکتائے روزگار الفاظ ہیں۔ پھر بھی دو اہم فرق ہیں جو ہمارے پیش نظر رہنے چاہئیں۔ ایک طرف تو قرآنی الفاظ کا مقام اور دوسری طرف قرآنی اسلوبِ بیان۔ قرآنی

اسالیب سے قطع نظر، قرآن کے الگ الگ الفاظ کی اکثریت دورِ نبوی کی عربی کے لیے نئی یا اجنبی نہیں تھی۔ نہ ہی ان نئے الفاظ کا استعمال روزمرہ کی عربی میں اتنا مشکل یا ناممکن تھا جتنا قرآنی اسلوب کو عام بول چال میں اختیار کر لینا۔ اس لیے ہم بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ قرآنی اسالیب دراصل قرآن کے نشاناتِ انگشت (فنگر پرنٹس) ہیں جنہیں کوئی انسانی اسلوب زبان ہرگز ہو بہو نقل نہیں کر سکتا۔

سورۃ المدثر میں موجود نئے الفاظ

سورۃ المدثر جس میں 256 الفاظ ہیں اور جو دو صفحات سے بھی کم میں سمائی ہوئی ہے۔ اس میں ہم بڑی آسانی سے کم از کم 84 نئے الفاظ گن سکتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں اس سورۃ کا تقریباً ایک تہائی نئے الفاظ پر مشتمل ہے۔ ذیل میں نئے الفاظ کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

1۔ **اَلرِّجزُ**: ایک نئی اصطلاح جو بتوں اور عذاب کے لیے استعمال ہوئی۔

2۔ **اَلنَّاقُورُ**: ایک نئی اصطلاح جو قیامت کی نشانی کے حوالے سے استعمال ہوئی جب اسرافیل علیہ السلام صور پھونکیں گے۔ الناقور بھی صور کا ہم معنی نیا لفظ ہے۔

3۔ **صُعُوداً**: یہ لفظ ایک استعاراتی عکس کے طور پر استعمال ہوا ہے، جس کے ذریعہ ایک سخت مشقت والے عذاب کی مثال دی گئی ہے جسے کافر محسوس کرے گا کہ وہ ایک تقریباً عمودی چڑھائی چڑھ رہا ہو اور اس کا دم پھولا جا رہا ہو۔

4۔ **بَسَر**: ایک نیا لفظ جس کا مطلب ہے کہ (کافر) آدمی کا منھ بگڑا یا چہرہ تاریک ہو گیا۔

5۔ **لَوَّاحَةٌ لِّلْبَشَرِ**: ایک کلمہ جس میں نئے معنی پنہاں تھے۔ یہاں یہ اس معنی میں استعمال ہوا ہے کہ وہ (دوزخ کی آگ) جسمانی کھال کو جھلسا کر سیاہ کر دینے والی ہے (للبشر)، یا انسانوں کو صاف دکھائی دینے والی۔

6۔ **کَفَرُوا**: قرآنی زبان کے حوالہ سے اس کے معنی ہیں دعوت اسلام کو رد کر دیا (جمع)، اصل لغوی معنی ہیں، چھپانا یا پوشیدہ رکھنا، اس طرح یہ معنی نکلے کہ دین اسلام کو نا ماننے

والوں نے اپنے دل ودماغ کے دروازے بند کر کے ''حق'' کو چھپایا۔

7۔ أُوْتُوا: نئے معنی کے ساتھ ایک جدید اختراع، یعنی انہیں دیا گیا یا دی گئی۔

8۔ رَهِيْنَةٌ: یہ لفظ اس بنیادی فعل ثلاثی مجرد سے بنایا گیا ہے جس کے معنی لغت کے اعتبار سے ''گروی رکھنا (کسی شخص یا زیور کو) ہیں۔ (اردو میں ہم بھی اسے ''رہن رکھنا'' بولتے اور لکھتے ہیں۔ مترجم) قرآن میں یہاں اس کا مطلب ہے انسانی نفوس کو وحدانیت اور درست، سیدھے راستہ کی ہدایت اور ذمہ داری دے کر بعد میں اس ذمہ داری کا حساب، کتاب کرنے کی تنبیہ۔

9۔ سَلَكَكُمْ: ''اس (دوزخ) میں لائے گئے'' کی جگہ ایک جدید صناعی استعمال کی گئی جس کے لفظی معنی یہ نکلتے ہیں کہ تمہیں اس (جہنم) کے راستہ پر لگایا۔

10۔ سَقَرٌ: جہنم کے لیے ایک نئی اصطلاح۔

11۔ قَسْوَرَةٌ: ایک نیا لقب بمعنی ''شیر''، یا تیر انداز یا کمانیں۔

12۔ اَلمَغْفِرَةُ: معافی یعنی گناہوں کی معافی کے حوالہ سے ایک نئی قسم کا لفظ۔

سورۃ المدثر میں اُدوات (Particles) کا نیا استعمال

اس حقیقت سے علاوہ بریں کہ سورۃ المدثر نئے الفاظ کی دولت سے مالا مال ہے۔ اس میں کم از کم 14 مرتبہ عربی ادوات (Particles) کو بالکل نئے انداز میں استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً حرف عطف 'ف' کو اس مقام سے ہٹا کر جو عربی زبان میں عام دستور کے مطابق رائج ہے، ایک دوسرے قطعی مختلف مقام پر رکھا گیا ہے۔ 'ف' عموماً دو افعال یا دو اسماء کے درمیان رکھا جاتا ہے تاکہ پہلے فعل کو دوسرے فعل سے، یا پہلے اسم کو دوسرے اسم سے جوڑا جائے۔ اس کے برخلاف ہم دیکھتے ہیں متواتر تین آیات (آیات 3 تا 5) میں اسے براہ راست مفعول (جو بجائے جملہ کے آخر میں آنے کے، بالکل شروع میں آ گیا ہے) اور اس کے فعل کے درمیان رکھا گیا ہے)۔ اس طرح آیات 3 تا 5 کی تلاوت یوں کی جاتی ہے: وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ (لفظی ترجمہ ''اور آپ کا رب، پس بڑائی بیان کیجئے'')، وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ (اور اپنے کپڑے، پس پاک

رکھئے‘‘)، اور وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ (’’اور بتوں (گناہوں) سے دور رہیں‘‘)، ساتویں آیت میں ہم اسے ایک مجرور کلمہ اور اس فعل کے درمیان پاتے ہیں جس کے ساتھ حرف جر جوڑا گیا ہے: وَلِرَبِّکَ فَاصْبِرْ (’’اور اپنے رب کے واسطے، تب انتظار کریں صبر سے‘‘)

اس کے علاوہ ہم دیکھتے ہیں کہ آیات 16، 32، 53 اور 54 میں ’کَلَّا‘ کو ایک تنبیہ، یا غالباً ’’سچ اور حق تو یہ ہے‘‘ کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے جب کہ عام طور پر ’کلا‘ لفظ ایک قطعی ’’نا‘‘ (ہرگز نہیں!) کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

آیات 19 اور 20 میں: فَقُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ، ثُمَّ قُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ (پس اس پر (اللہ کی) مار ہو، اس نے کیسی تجویز کی: ہاں اس پر پھر (اللہ کی) مار (یعنی لعنت) ہو، اس نے کیسی تجویز کی!۔ آیات میں لفظ ’کیف‘ (کیسی) جو عام عربی میں سوالیہ جملہ میں استعمال ہوتا ہے، سوالیہ معنی میں نہیں بلکہ استعجابیہ انداز میں استعمال ہوا ہے۔ نہ ہی یہ تعلقِ فعل (Adverb) کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ بلکہ یہ ’مصدر‘ کی طرح استعمال ہوا ہے[15] اور اس صورت میں اس کا مفہوم اس کے بعد آنے والے فعل کے مفہوم کے ساتھ سمجھا جا سکتا ہے۔ اب ’کیف‘ فعل مجہول ’قتل‘ کے فاعل کے طور پر سمجھا جائے گا۔ اس طرح جملہ ’’قتل تقدیرہ‘‘ کے لغوی معنی ہوں گے ’’اس کی تجویز (یا چالبازی) ہلاک کر دی گئی‘‘ یا اس کی تجویز (چالبازی) پر ہلاکت یا بربادی آ جائے‘‘۔ ایک اور مفہوم اختیار کر لیں، دونوں قرآنی آیات میں مستعمل لفظ ’کیف‘ کا سوالیہ یا تعلق فعل والا مفہوم لینے کی کوئی بنیاد نہیں بنتی۔

علاوہ بریں، آیات 24 اور 25 میں لفظ ’’اِن‘‘ نفی کے مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے: یوں یہ ’ما‘ یا ’لیس‘ کے متبادل کے طور پر برتا گیا ہے۔ یہ دونوں آیات یوں ہیں: ’’فَقَالَ إِنْ هَذَا إِلَّا سِحْرٌ يُؤْثَرُ، إِنْ هَذَا إِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ‘‘، پھر کہنے لگا: یہ (قرآن) کچھ نہیں مگر (اِنْ هَذَا إِلَّا) جادو، جو پہلے زمانہ سے چلا آتا ہے۔ یہ قرآن کچھ نہیں مگر انسان کا کلام! حرف ’’اِن‘‘ کا یہ فیاضانہ اور مخصوص استعمال بالکل ’کان‘ اور مازال (اب بھی بلاتوقف) کی طرح جس کے فوراً بعد فعل زمانہ حال (مضارع) کی شکل میں آتا ہے، پورے قرآن میں جا بجا ملتا ہے۔ جب کہ دوسری طرف قبل اسلام شاعری میں تلاشِ بسیار کے باوجود مجھے ایسی کوئی ایک بھی مثال نہیں مل سکی۔

المدثر جیسی مختصر سورۃ میں، جو دور نبوی ﷺ کے بالکل اول ایام میں نازل ہوئی تھی، 84 نئے الفاظ کی موجودگی ایک ایسی زبردست صلاحیت کی نشاندہی کر رہی تھی جو اس کلام کے اولین سننے والوں کے دل و دماغ میں ایک ہلچل بپا کر دے۔ اس حقیقت کے تناظر میں یہ کوئی تعجب خیز بات نہیں ہونا چاہیے کہ سورۃ فصلت (41) کی 13 آیات سن کر، عتبہ ابن ربیعہ، جو قریش کے ایک نامور سردار اور عربی زبان کے ماہر تھے، بالکل گنگ اور مبہوت حالت میں اپنے قبیلہ کے لوگوں میں واپس آئے۔ پوری سورۃ کا بمشکل کوئی ایک، آدھ لفظ ان کی سمجھ میں آسکا۔ یہ تو رہی بات صرف نئے الفاظ کے اثر کی۔ اب اگر ہم قرآن کریم کی بے شمار نئی تراکیب، تشبیہات، اسلوب زبان و بیان، استعارات، کثیر المعانی بیانات اور عام ڈگر سے منحرف شاندار کلمات جو قرآنی زبان کے ان نئے دانشورانہ اور معاشراتی اثرات سے مزین تھے اور جنہوں نے ان اثرات کے ساتھ مل کر قرآن کی اثر انگیزی میں مزید اضافہ کیا، کو بھی زیر غور لائیں تو ہم اس زبردست بھونچال کا تصور بھی نہیں کر سکتے جو قرآن کریم کی زبان و بیان نے اس زمانہ کی ادبی و معاشرتی فضا میں برپا کیا ہوگا۔

لسانی اکائی کی ترتیب نو

جس وقت قرآنی طوفان نیا نیا وارد ہو رہا تھا تو اس نے اپنی زبان اور اپنے پیغام کے ساتھ مل کر فضا میں ایک زبردست تاثر قائم کیا۔ اس وقت کے سامعین کے لیے یہ ایک یادگار لمحہ تھا۔ ان کی موجودگی میں کتاب مقدس نازل ہو رہی تھی، لیکن جیسے جیسے وقت گزرا اور بعد میں آنے والی نسلیں قرآنی زبان و اسلوب کی عادی ہوتی گئیں، اپنے سامعین پر قرآن کریم کے غیر معمولی اثرات میں سے حیرت اور استعجاب کا پہلو کم ہوتا چلا گیا اور وہ بات نہ رہی جو قرآن کے اول اول سامعین نے محسوس کی تھی۔ اب قرآن کا نیا لسانی انداز لوگوں کو چلتے چلتے ٹھہرنے پر مجبور نہیں کرتا تھا جیسا تازہ نزول کے فوراً بعد کرتا تھا۔ اپنی تمام جدت طرازیوں میں سے ایک قرآن کی 'آیت' تھی جس سے اس کے اولین سامعین عجب شش و پنج میں مبتلا تھے۔ 'آیت' ایک نیا نظریۂ بیان تھی جو نثری جملہ اور شعر جیسی بیانیہ اکائیوں سے مختلف چیز تھی۔ اس لسانی اکائی

(وحدانیہ) آیت نے بیان کے ان حصوں کو توڑ کر پیش کیا جنہیں جوڑنے کے اہل عرب عادی تھے، اور ان حصوں کو جوڑنا شروع کیا جنہیں وہ توڑنے کے عادی تھے۔ نتیجۃً اس نئے رجحان نے عربوں کی لسانی بنیاد میں ایک ایسی دراڑ ڈال دی جس نے عربی زبان کو ایک نئی جہت عطا کی اور اس کے روایتی افق کو مزید وسعت بخشی۔

اب براہ مہربانی میرے ساتھ سورہ آل عمران (3) کی شروع کی دو آیات پر مشتمل ایک مختصر سے حصہ کی تلاوت کیجئے جو درج ذیل ہے:

(آیت 3ب) وَأَنزَلَ التَّوْرَاةَ وَالإِنجِيلَ

(وہی اللہ سبحانہ وتعالیٰ) تو ہے جس نے تورات اور انجیل نازل فرمائی ہیں۔

(آیت نمبر 4) مِن قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَأَنزَلَ الْفُرْقَانَ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُواْ بِآيَاتِ اللّهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ .....

(جیسے اس سے قبل لوگوں کی رہنمائی کے لیے (کتابیں اتاری گئیں اور (اب اسی طرح) اس نے حق اور باطل میں امتیاز کرنے والا (قرآن) نازل فرمایا ہے، بیشک جو لوگ اللہ تعالیٰ کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں ان کے لیے سنگین عذاب ہے۔

یہاں غور فرمائیے کہ تیسر آیت جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی ختم ہو جاتی ہے، یعنی ''اس سے قبل'' (مِن قَبْلُ) تعلقِ فعل (Adverb) جو جملہ فعلیہ ''تورات شریف اور انجیل مقدس نازل فرمائی ہیں'' (وَأَنزَلَ التَّوْرَاةَ وَالإِنجِيلَ) سے متعلق ہے اور یہ بھی دیکھئے کہ اس طرز سے بالکل مخالف بات چوتھی آیت میں نظر آتی ہے جہاں جملہ ختم ہو جانے کے بعد بھی آیت جاری رہتی ہے (جملہ 'لِّلنَّاسِ' پر ختم ہو گیا تھا) اور ایک نیا جملہ یہاں سے شروع ہو جاتا ہے (''اور اب اسی طرح) اس نے حق اور باطل میں امتیاز کرنے والا (قرآن) نازل فرمایا ہے....'') آیت یہاں بھی ختم نہیں ہوتی بلکہ ایک اور نیا جملہ شروع ہو جاتا ہے جس کا عربی قواعد کی رو سے گزشتہ جملہ سے کوئی تعلق نہیں ہے (بیشک جو لوگ اللہ تعالیٰ کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں ان کے لیے سنگین عذاب ہے...) (إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُواْ بِآيَاتِ اللّهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ.....)

اسی طرح سورۃ روم (30) کی شروع کی پانچ آیات پر غور کرنے کے لیے میں نے ان مقامات پر خطوط تحویلہ (//) لگا دیئے ہیں جہاں سے ہماری لسانی روایات اور اکائیوں سے واقفیت کے مطابق ہم توقع کریں گے کہ اس مقام پر ایک آیت ختم ہو جائے اور دوسری نئی آیت شروع ہو:

(آیت نمبر 1) الٓمّٓ (آیت نمبر 2) غُلِبَتِ الرُّومُ، (آیت نمبر 3) فِيٓ أَدۡنَى ٱلۡأَرۡضِ // وَهُم مِّن بَعۡدِ غَلَبِهِمۡ سَيَغۡلِبُونَ، (آیت نمبر 4) فِي بِضۡعِ سِنِينَ // لِلَّهِ ٱلۡأَمۡرُ مِن قَبۡلُ وَمِنۢ بَعۡدُ// وَيَوۡمَئِذٖ يَفۡرَحُ ٱلۡمُؤۡمِنُونَ، (آیت نمبر 5) بِنَصۡرِ ٱللَّهِ // يَنصُرُ مَن يَشَآءُ // وَهُوَ ٱلۡعَزِيزُ ٱلرَّحِيمُ.

(آیت نمبر 1) الم (آیت نمبر 2) اہل روم (فارس سے) مغلوب ہو گئے، (آیت نمبر 3) نزدیک کے ملک میں// اور وہ اپنے مغلوب ہونے کے بعد عنقریب غالب ہو جائیں گے، (آیت نمبر 4) چند ہی سال میں// امر تو اللہ ہی کا ہے پہلے (غلبۂ فارس میں) بھی اور بعد (کے غلبۂ روم میں) بھی//، اور اس دن اہل ایمان خوش ہوں گے، (آیت نمبر 5) اللہ کی مدد سے//، وہ جس کی مدد چاہتا ہے مدد فرماتا ہے//، اور وہ غالب ہے مہربان ہے۔

اوپر دیئے ہوئے قرآنی حصہ سے یہ بات بخوبی واضح ہو جانی چاہیے کہ ان پانچوں آیات کی قرآنی تقسیم۔ یعنی وہ نقاط و مقامات جہاں ایک آیت ختم ہوتی ہے اور دوسری شروع ہوتی ہے۔ ان طریقوں سے کوئی علاقہ و مماثلت نہیں رکھتی جن طریقوں سے ہم ایک زمانہ سے ایک جملہ کو دوسرے جملہ سے الگ کرتے آئے ہیں۔

روایتی اُدوات وصل و فصل کی نئی صورت حال

درج بالا بحث اور مثالوں سے 'منفصل' (عام موقع محل سے دور) اور متوصل (عام موقع کے بجائے قریب) جملوں کی ایک بالکل نئی سوچ نظر آتی ہے جسے قرآن نے عملی جامہ پہنایا ہے۔ یہی نئی سوچ اور اس کا استعمال قرآن کے لسانی میدان کی سب سے زیادہ معرکۃ الآراء، عالمگیر خوبی ہے۔ اس نئے اسلوب کا سب سے نمایاں پہلو و، ف، اذ، ان، انما، اور قد جیسے

حروف (Particles) کی غیر موجودگی اور ھو، ھی، ھم جیسی ضمیروں کا اپنی عام لسانی روش سے ہٹ کر جملوں کے درمیان میں علیحدہ الفاظ کی حیثیت سے استعمال ایک ایسا رجحان تخلیق کرتا ہے جو زبان کی عرصۂ دراز سے تسلیم شدہ ''علاقائی سرحدوں'' کو مٹا دیتا ہے۔ اس رجحان کی مثال دینے کے لیے آیئے سورہ رعد (13:33) کے ایک حصہ کا مطالعہ کریں:

أَفَمَنْ هُوَ قَآئِمٌ عَلَى كُلِّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ وَجَعَلُواْ لِلّهِ شُرَكَاء قُلْ سَمُّوهُمْ أَمْ تُنَبِّئُونَهُ بِمَا لاَ يَعْلَمُ فِي الأَرْضِ أَم بِظَاهِرٍ مِّنَ الْقَوْلِ بَلْ زُيِّنَ لِلَّذِينَ كَفَرُواْ مَكْرُهُمْ وَصُدُّواْ عَنِ السَّبِيْلِ وَمَن يُضْلِلِ اللّهُ فَمَا لَهُ مِنْ هَادٍ.

کیا پھر وہ (اللہ) جو ہر جان پر اس کے اعمال کی نگہبانی فرما رہا ہے اور (وہ بت جو کافر) لوگوں نے اللہ کے شریک بنا لیے (ایک جیسے ہو سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں!) آپ فرما دیجئے کہ ان کے نام (تو) بتاؤ، (نادانو!) کیا تم (اللہ) کو اس چیز کی خبر دیتے ہو جس (کے وجود) کو وہ ساری زمین میں نہیں جانتا یا (یہ صرف) ظاہری باتیں ہی ہیں (جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں) بلکہ (حقیقت یہ ہے کہ) کافروں کے لیے ان کا فریب خوش نما بنا دیا گیا ہے اور وہ (سیدھی) راہ سے روک دیئے گئے ہیں، اور جسے اللہ گمراہ ٹھہرا دے تو اس کے لیے کوئی ہادی نہیں ہو سکتا۔

اگر ہم درج بالا متن کو عام عربی زبان میں لکھنا چاہیں اور اسی مفہوم کو پہلے سے طے شدہ قواعد وضوابط اور روایت کے مطابق ادا کرنا چاہیں تو ہمیں وہ الفاظ تلاش کرنا پڑیں گے جو قرآنی متن میں حذف کر دیئے گئے ہیں اور ان الفاظ کو اپنی اپنی جگہ واپس رکھ کر عبارت لکھنا پڑے گی۔ اس تبدیلی کا نتیجہ کچھ اس طرح کی عبارت کی شکل میں ظاہر ہوگا:

أَفَ (هكذا يكون) مَن هُوَ قَآئِمٌ عَلَى كُلِّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ وَ(قد) جَعَلُواْ لِلّهِ شُرَكَاء (ف) قُلْ (لهم) سَمُّوهُمْ (أذن) أَمْ (تظنون أنكم) تُنَبِّئُونَهُ بِمَا لاَ يَعْلَمُ (بما يوجد) فِي الأَرْضِ أَم (أن هذا) بِظَاهِرٍ مِّنَ الْقَوْلِ (منكم) بَلْ (الحق أنه قد) زُيِّنَ لِلَّذِينَ كَفَرُواْ مَكْرُهُمْ وَصُدُّواْ عَنِ السَّبِيْلِ...

اس طرح لکھنے میں ہم دیکھتے ہیں کہ صرف ایک آیت میں کم از کم دس مقامات سے الفاظ حذف کیے گئے ہیں۔

اب ہم درج ذیل آیات میں ان مقامات پر غور کرنے کی کوشش کریں گے جنہیں جلی حروف میں لکھا گیا ہے اور جہاں سے متوقع حرفِ عطف (Conjunction) حذف کیا گیا ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ لاَ يَعْلَمُونَ لَوْلاَ يُكَلِّمُنَا اللّهُ أَوْ تَأْتِيْنَا آيَةٌ كَذَلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِن قَبْلِهِم مِّثْلَ قَوْلِهِمْ تَشَابَهَتْ قُلُوبُهُمْ قَدْ بَيَّنَّا الآيَاتِ لِقَوْمٍ يُوقِنُونَ (البقرۃ2:118)

اور جو لوگ علم نہیں رکھتے کہتے ہیں کہ اللہ ہم سے کلام کیوں نہیں فرماتا یا ہمارے پاس (براہ راست) کوئی نشانی کیوں نہیں آتی؟ اسی طرح ان سے پہلے لوگوں نے بھی انہی جیسی بات کہی تھی، ان (سب) لوگوں کے دل آپس میں ایک جیسے ہیں، بیشک ہم نے یقین کرنے والوں کے لیے نشانیاں خوب واضح کر دی ہیں۔

قُلْ إِنِّىْ عَلَى بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّىْ (وَكَذَّ) بْتُم (بِهِ مَا) عِندِىْ مَا تَسْتَعْجِلُونَ (بِهِ إِنِ) الْحُكْمُ إِلاَّ لِلّهِ يَقُصُّ الْحَقَّ.... (سورۃ الانعام 6:57)

فرما دیجئے: (کافرو!) ''بیشک میں اپنے رب کی طرف سے روشن دلیل پر قائم ہوں اور تم اسے جھٹلاتے ہو۔ میرے پاس وہ (عذاب) نہیں ہے جس کی تم جلدی مچا رہے ہو۔ حکم صرف اللہ ہی کا ہے۔ وہ حق بیان فرماتا ہے....''

وَسَخَّرَ الشَّمْسَ (وَالْقَمَرَ كُلٌّ) يَجْرِىْ لأَجَلٍ (مُّسَمًّى يُدَبِّرُ) الأَمْرَ (يُفَصِّلُ) الآيَاتِ لَعَلَّكُم بِلِقَاء رَبِّكُمْ تُوقِنُونَ (سورۃ رعد 13:2)

اور اس نے سورج اور چاند کو نظام کا پابند بنا دیا۔ ہر ایک اپنی مقررہ میعاد (میں مسافت مکمل کرنے) کے لیے (اپنے اپنے مدار میں) چلتا ہے، وہی (ساری کائنات کے) پورے نظام کی تدبیر فرماتا ہے، (سب) نشانیوں (یا قوانین فطرت) کو تفصیلاً واضح فرماتا ہے تاکہ تم اپنے رب کے روبرو حاضر ہونے کا یقین کر لو۔

اس طرح حروف والفاظ کی تحذیف (حذف کرنا) محض ایک نیا لسانی اسلوب ہی نہیں ہے جس کا قرآن کریم نے عربی زبان میں اضافہ کیا ہے، بلکہ یہ ایک انتہائی اہم تخلیقی ہنر اور فصاحت وبلاغت کی وجہ سے اثر انگیزی کا حامل ایک اضافہ بھی ہے۔ یہ اس لیے کہ اس طرح کا اضافہ قرآنی بیان کو ایسی باوقار جہتیں اور خیال کی لطافتیں عطا کرتا ہے جو اس اضافہ کے بغیر ممکن

نہیں تھیں۔ جب صرف ایک ہی آیت میں متعدد اقسام کی تحذیفات ظہور پذیر ہوتی ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ آیت اپنی سلاست وروانی میں اپنے اصل، بنیادی مطلب سے بھی بہت زیادہ اعلیٰ وارفع ہوجاتی ہے۔

جدید بین الالفاظ تعلق

درج بالا مطالعہ سے جو لسانی رجحان سامنے آتا ہے وہ اس بات سے متعلق ہے کہ 'آیات' یا جملوں کے درمیان کیا عمل کارفرما ہے۔ پھر بھلا ایک ایک لفظ میں اور مختلف الفاظ کے درمیان تعلق کی کیا کیفیت ہے؟ قرآن نے بین الالفاظ تعلق کا ایک نیا تانا بانا پیش کیا۔ جدید زمانہ میں نئے لسانی مدارس (جیسے اشاراتی اسلوب اور تجریدی قسم کے مدارس خیال) کے قیام سے قبل، یہ نئی قسم کا بین الالفاظ تعلق نہ صرف عرب معاشرہ میں، بلکہ اس لحاظ سے دوسرے معاشروں میں بھی، قرآن کے نازل ہونے سے پہلے مفقود تھا۔ یوں اس بین الالفاظ، قرآنی تانے، بانے نے تخلیقی فکر وخیال کے نئے افق ہویدا کیے جنھوں نے تحریر کے عام بنیادی مفہوم میں مزید گہرائی اور گیرائی پیدا کی۔

مثال کے طور پر سورۃ فاتحہ کی چوتھی آیت 'مَالِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ' (قیامت کے دن کا مالک یا شہنشاہ)' میں الفاظ کا ایسا نرالا تعلق ہے جس کے اصول تعامل سے دور نبوی کے عرب لوگ قطعاً ناواقف تھے۔ قرآن کے اول اول سامعین کو اس نئے لفظی تعلق میں اور اپنے پرانے، شناسا ادبی لفظی تعلق میں ایک واضح فرق محسوس ہوا۔ اسی لیے جب انھوں نے یہ آیت پہلی مرتبہ سنی تو اس نئے اسلوب کی اثر انگیزی نے انہیں اندر سے ہلا کر رکھ دیا۔ اس اثر انگیزی کی وجہ یہ بھی ہے کہ اس وقت تک ان کی 'لسانی تجربہ گاہ' محض حسی اور ابتدائی مرحلہ میں تھی، اور اس وقت تک تحقیق اور تجزیہ کے وہ آلات انہیں میسر نہیں تھے جو آج ہمارے پاس ہیں۔ قرآن کے نزول کے دور میں لفظ 'مَالِکِ' کا لفظ 'یَوْمِ' کے ساتھ متعلق ہونا، عربوں اور غیر عرب لوگوں کے لیے یکساں طور پر نیا تھا۔ اس وقت اور آج اس زمانہ میں بھی لفظ 'مَـــالِکِ' (ملکیت ہونا) کا تعلق ایسی اشیا کے ساتھ ہوتا ہے جو ٹھوس حالت میں ہمارے قبضہ میں آسکتی ہوں جیسے ''جائیداد کا مالک''، روپیہ کا

مالک'' یا ''کار کا مالک'' وغیرہ۔ لیکن کوئی شخص ایک دن کا مالک کیسے ہوسکتا ہے؟ کیا وقت جیسی غیر مرئی چیز پر بھی کسی کا اجارہ ہوسکتا ہے؟ کیا بینک اور ان جیسے دوسرے مالیاتی ادارے وقت کا کھاتا کھولنے کے لیے آمادہ ہوں گے جس میں ساعتیں اور ایام جمع کیے جاسکیں گے؟ اس طرح یہ عجیب کلمہ ''اس دن کا مالک'' ساتویں صدی عیسوی کے عربوں کے لیے ایک ایسا لسانی اچنبھا لیے ہوئے تھا جس کا ذائقہ بالکل منفرد تھا۔ مگر معاملہ یہیں پر بس نہیں ہوگیا۔ ابھی حیرتوں کا مزید سامان دسترخوانِ زبان پر اترنے ہی والا تھا۔ ابھی ان لوگوں نے خلجان میں مبتلا کردینے والا ایک چوراہا عبور کیا ہی تھا کہ ایک اور راستہ کا ٹریفک سگنل ان کے سامنے آگیا جس کی وہ ہرگز توقع نہیں کررہے تھے، اور یہ سگنل ان کے سامنے لفظ 'یوم' اور 'الدین' کے درمیان ظاہر ہوا تھا۔ عرب کیا اور غیر عرب کیا، سب ہی اقوام وقت کی کوئی اکائی ظاہر کرنے والے لفظ کو کسی ایسے لفظ سے جوڑنے کے عادی رہے تھے جو کسی واقعہ کو بیان کرے جو اس خاص وقت میں پیش آنے والا ہو، مثلاً کوئی یوں تو کہہ سکتا ہے کہ ایک ثانیہ کی خاموشی، یا کام کا ایک گھنٹہ، جنگ کا دن، روزوں کا مہینہ، سوگ کا سال، جنگ کا عرصہ، بیداری کا عہد وغیرہ۔ قرآن نے لفظ 'دین' کے جو نئے معنی اپنے اولین سامعین کو سمجھائے، ان معنی سے پہلے وہ لوگ دین کے ایک تجریدی معنی 'مذہب' سے ہی واقف تھے جو کسی واقعہ سے ہرگز متعلق نہیں تھا۔ ابھی سامعین 'مَالِکِ یَوْمِ' (دن کا مالک) کی ندرت وجدت کے جھٹکہ سے سنبھلنے بھی نہیں پائے تھے کہ 'یَوْمِ الدِّیْنِ' (قیامت کا دن) کے نئے معنی کا ایک جھٹکہ اور برداشت کرنا پڑا۔ یوں ساتویں صدی کے عربوں کو سورۃ فاتحہ اور قرآن کی دوسری سورتوں کے سفر میں غیر متوقع سرعت کے ساتھ ایسے کئی موڑوں سے واسطہ پڑا، جنہوں نے انہیں چکرا کے رکھ دیا۔ نتیجتاً ان کے محدود لسانی ذوق کو ان تار برقی جیسے مختصر، لیکن انتہائی موثر آسمانی پیغامات کو ان کے شایان شان جگہ دینے کے لیے کافی جدوجہد کرنا پڑی۔ اس جدید انداز نے سامعین کو الفاظ کلمات اور جملوں کے درمیان ربط وتعلق کی ایک نئی لڑی سے روشناس کیا۔ بالکل ہیرے کی طرح، زبان کی اس ماہرانہ تراش خراش کے مختلف پہلوؤں نے مل کر ایک ایسا انقلاب برپا کیا جس کے اثرات عربی اور غیر عربی زبانوں کی حدود سے ماورا، انسانی تصورات، استعاراتی استعمال اور اظہار خیال کے دوسرے واسطوں تک پہنچ گئے۔

تشبیہات کی جدید قرآنی لغت

قبلِ اسلام کے عرب شعراء اکثر و بیشتر مروجہ تمثیلات کو ہی بار بار استعمال کرتے تھے۔ اگر کسی شاعر کی دی ہوئی تشبیہ دوسرے شاعر کو بھلی معلوم ہوئی تو وہ بھی اسے استعمال کر لیتا تھا۔ کبھی تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ اور کبھی من وعن، اپنے کہے ہوئے اشعار کے سانچے میں ڈھال لینا عام تھا۔ عربی شاعری کی تمثیلات کا قبل اسلام سے جاری کئی صدیوں کا اثر نہ صرف نظم ونثر، بلکہ روزمرہ کی عام گفتگو میں بھی در آیا۔ یہی اثر اسلام کے ہم عصر لوگوں پر بھی تھا۔ ان کا ماخذ عربوں کا ماحول تھا جس سے وہ بخوبی مانوس تھے۔ اسی وجہ سے ایک بہادر شخص کو 'شیر' بزدل کو شتر مرغ، فیاض شخص کو سمندر، کنجوس کو بنجر زمین، کینہ پرور کو اونٹ، پیٹو کو ہاتھی، متین، غیر متزلزل کو پہاڑ، صاحب جمال خوبصورت شخص کو سورج یا چاند، مہذب شخص کو ستارہ، ثابت قدم کو خیمہ کی میخ، لاابالی، بے پرواہ شخص کو تتلی، نرم مزاج دبّو قسم کے شخص کو بھیڑ، ضدی اڑیل شخص کو غلاظت کا کیڑا، مغرور متکبر کو مور، چالاک، عیار کو لومڑی، کالے بالوں کو رات، سفید بالوں کو دن، محبوبہ کے دانتوں کو ہیرے کی انی، منھ کے دہانہ کو حلقہ یا گلبہار، اس کے ہونٹوں کو پھول کی پنکھڑی، اس کے عارضوں کو گلاب یا سیب، اس کے آنسوؤں کو موتی، اس کی انگلیوں کے پوروں کو بیر، اس کی آنکھوں کو گل نرگس، اس کے قامت کو بھالے، اس کی پیشانی کو صبح کی روشنی، اس کے ابروؤں کو تیروں، اس کی کنپٹیوں پر لہراتی ہوئی زلفوں کو بچھوؤں، اور اسی طرح کی دوسری بہت سی چیزوں سے تشبیہ دی جاتی تھی۔

جہاں تک قرآن کریم کا تعلق ہے، اس نے اپنے بیان میں موروثی تمثیلات کو رد کر کے اپنی ذاتی بالکل تازہ، بتازہ توضیحی تمثیلات سے تبدیل کر دیا۔ اگر چہ کہ میں نے قرآنی تمثیلات کا کوئی غیر معمولی عمیق جائزہ نہیں لیا ہے، پھر بھی اس مطالعہ وتحقیق کے دوران جن آیات کو میں نے اس نظریہ سے پرکھا ہے میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ شدت اظہار کا جو آتش فشاں قرآن سے پھوٹا وہ محض اپنی کمیت کے لحاظ سے ایک عظیم الشان ذخیرہ الفاظ تک ہی محدود نہیں تھا جس نے عربی لغت کی استعاراتی تمثیلات میں زبردست اضافہ کیا۔ یہ صفت بھی اپنی جگہ قابل

لحاظ ہے، لیکن جس طرح قرآن کے اسلوب بیان نے تمام قدیم وروایتی اسالیب بیان کو اپنی جدت ونکتہ آفرینی سے بہت پیچھے چھوڑ دیا تھا، اسی طرح قرآنی تمثیلات نے اپنی زبردست اثراتی گرفت، رفتار اور جدت آفرینی سے ان تمام تمثیلات کو مات دی جن سے قبل اسلام کی شاعری کے دواوین (دیوان کی جمع) بھرے پڑے تھے۔ قرآن نے تمام قدیم توضیحی تمثیلات کے ذخیرہ کو اس حد تک ترک کیا کہ مجھے قرآن کی کسی ایک آیت میں بھی کوئی قدیم مستعمل تمثیل نہیں ملی۔

اس سے بھی زیادہ اہم یہ حقیقت ہے کہ قرآن نے اعلیٰ ترقی یافتہ متنوع اور بظاہر ایک دوسرے سے غیر متعلق محسوس ہونے والے، تمثیل کے مختلف اجزاء میں اُنہونے روابط متعارف کروائے۔ ان اجزاء نے جو ہم عصر ادبی رجحانات سے بہت بعد کے زمانہ کی چیز تھے، روایتی لسانی امیج اور تمثیل کے فنکارانہ ڈھانچہ میں ایک بنیادی انقلاب برپا کر دیا۔ جہاں تک اس زمانہ میں زیر استعمال تمثیلات کا تعلق ہے وہ اپنے معیار، تخلیقی صلاحیت، کمیت وتعداد میں محدود اور ان عناصر پر مشتمل ہیں جن کو جوڑنے والی کڑیاں بھی اپنے امکانات میں محدود نوعیت کی اور صرف صنف شاعری میں مستعمل تھیں۔ قرآن نے ان تمام حد بندیوں کو توڑ ڈالا اور عربی خیال آفرینی کو تمثیلات کے ایک نئے زمانہ اور نئی دنیا میں داخل کر دیا جو اتنی جدید جہتوں، اندرونی فعالیت کار اور بین العناصر تعلقات کی ثروت کے تناظر میں نزول قرآن سے پہلے کی عربی نظم ونثر میں یکساں طور پر ناپید تھیں۔

عربی زبان کے خطیبوں نے جو روایتی قواعد وضوابط وضع کیے ہیں اور جن پر وہ کاربند بھی رہے ہیں، استعاراتی تمثیلات کو چار اجزا میں تقسیم کیا ہے: (1) مشبہ یعنی اپنی جگہ ایک آزاد ومستقل جز جسے اپنے مطلب کے اظہار کے لیے کسی اور معلوم چیز سے تشبیہ دی جائے، (2) مشبہ بہ، ''وہ دوسری چیز'' جس سے تشبیہ دے کر ''مشبہ'' کا مطلب بیان کیا جارہا ہو، (3) اداۃ التشبیہ، یعنی وہ لفظ جو کسی موازنہ یا مثال کی موجودگی کی طرف اشارہ کرے (مثلاً ''جیسے، جس طرح، ہو بہو'' وغیرہ) اور (4) وجہ شبہ، وہ نقطۂ مماثلت جس سے ایک مشبہ چیز کو دوسری مشابہ چیز سے ملایا جارہا ہو، کسی تشبیہ کی درجہ بندی اس لحاظ سے کی جاتی تھی کہ اس میں ان چاروں اجزاء میں سے کسی ایک جز یا ایک سے زیادہ اجزاء کی صاف نشاندہی کی گئی ہے نہیں؟ مگر جب ہم

قرآن میں پائی جانے والی تمثیلات کی درجہ بندی ان روایتی قواعد وضوابط کے مطابق کرنا چاہتے ہیں جو صدیوں سے مسلمہ ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ قرآنی تشبیہات کی ایک بڑی تعداد ان قوانین سے بالاتر ہے اور ان کی درجہ بندی اس طرح نہیں کی جاسکتی۔ مثلاً درج ذیل تمثیلات کا موروثی قاعدوں کی بنیاد پر تجزیہ نہیں کیا جاسکتا:

☆ ''وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ'' (''اور تمہارے لیے قصاص (یعنی خون کا بدلہ لینے) میں ہی زندگی (کی ضمانت) ہے'') (سورہ بقرۃ 2:179)

☆ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوبُ (کتنا بے بس ہے طالب (عابد) بھی اور مطلوب (معبود) بھی (سورۃ حج 22:73)

☆ 'وَأَفْئِدَتُهُمْ هَوَاءٌ' (اور ان کے دل شکست سے خالی ہو رہے ہوں گے (سورۃ ابراہیم 14:43)

☆ وَيَقْذِفُونَ بِالْغَيْبِ مِن مَّكَانٍ بَعِيدٍ اور وہ ان دیکھے دور کی جگہ سے باطل گمان کے تیر پھینکتے رہے ہیں (سورۃ سبا 34:53)

کثیر الجہتی تمثیلات

نبی اکرم ﷺ کے زمانہ کے عربوں کا اپنی زندگی میں کثیر الجہتی تمثیلات سے پہلے پہل سابقہ اس وقت پیش آیا جب قرآن مجید نازل ہونا شروع ہوا۔ جب عربی ماہرین زبان و بیان نے عربی خطاب و بیان کے اصول وضع کرنے کی ابتدا کی اور استعارات کے مختلف اجزا کا فرداً فرداً تجزیہ کرنا شروع کیا تو ان کے لیے اس امر کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ قرآنی تمثیلات کو اپنے وضع کردہ کلیات وقوانین بیان سے خارج قرار دے دیں، کیونکہ وہ ان قوانین کے تقاضوں پر پورا نہیں اترتی تھیں بلکہ یوں کہنا زیادہ درست ہوگا کہ عربوں کے وضع کردہ محدود انسانی ضوابط قرآنی تمثیلات کی پیش کردہ جہات کا احاطہ کرنے میں قطعی ناکام ہوگئے۔

اب جہاں تک ان لوگوں کا تعلق ہے جو قرآن اور اسلام سے دور ہی رہنا چاہتے تھے انھوں نے قرآنی تمثیلات کی اس 'ندرت' کو جو روایتی قواعد وضوابط پر پورا نہیں اترتی تھیں،

قرآن کی ایک خامی تصور کی جس کی بنیاد پر وہ مسلمانوں کے عقیدہ پر حملہ کر سکتے تھے۔ بدنام زمانہ، نام نہاد، آزاد خیال مفکر ابن الراوندی نے، جس کی جدت طرازیوں، عقلیت اور دور رس نکتہ آفرینیوں کے گن گائے جاتے ہیں، ایک مرتبہ ماہر ادیب و زبان داں ابن اعرابی سے قرآن کی اس آیت کی بابت تضحیکاً پوچھا، جس کا لفظی ترجمہ ہے ''اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اس (اللہ کی ناشکری کرنے والی بستی) کو بھوک اور خوف کے لباس کا مزہ چکھادیا'' (فَأَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوعِ وَالْخَوْفِ) (16:112)،[16] ''کیا لباس کو چکھا جا سکتا ہے؟'' ابن اعرابی نے جواباً ارشاد فرمایا ''اچھا ٹھیک ہے اے مسخرے: فرض کر لو محمد پیغمبر نہیں تھے مگر تم اس حقیقت سے تو انکار نہیں کر سکتے کہ وہ ایک عرب تھے!'' گویا ابن الراوندی کا آیت کو چیلنج کرنے سے یہ مقصد تھا کہ فصیح عربی زبان میں یہی بات اس طرح کہی جانی چاہیے تھی، فَكَسَاهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوعِ (''اللہ نے اسے بھوک کا لباس پہنا دیا'') یا فَأَذَاقَهَا اللّٰهُ طَعَامَ الْجُوعِ (''پھر اللہ نے اسے بھوک (کی تلخی) کا مزہ چکھا دیا'')[17]

نادیدہ حقیقتوں کی منظر کشی

میں یہاں جس قسم کی منظر کشی کی طرف اشارہ کر رہا ہوں، اس میں معنی اخذ کرنے کا اختیار انسانی تصور کو دے دیا جاتا ہے، کیونکہ اس قسم کی تشبیہات ''مشبہ'' (جس چیز کی تشبیہ دی جارہی ہے) اور ''مشبہ بہ'' (جس چیز سے تشبیہ دی جارہی ہے) کا مقام ایک دوسرے سے بدل کر استعمال کیا جاتا ہے جس کا ادراک کرنے سے ہماری عام انسانی حسیات عاری ہوتی ہیں۔ یا ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ اس میں ایک معلوم چیز کو کسی ایسی نامعلوم چیز سے مشابہ قرار دیا جائے جو کبھی پہلے ہمارے مشاہدہ، تجربہ یا علم میں ہی نہ آئی ہو۔

اس قسم کی ایک تشبیہ، جس نے قرون اولیٰ کے خطیبوں کی توجہ حاصل کی، وہ ہے جس میں قرآن نے جہنم میں موجود ایک درخت 'زَقُّوم' کے پھل کو ''شیاطین کے سروں'' سے تشبیہ دی ہے (زقوم کا ترجمہ کسی مفسر نے مہلک پھل والا درخت اور کسی مفسر نے بغیر ترجمہ کیے، قرآنی لفظ زقوم ہی لکھا ہے۔ سورہ صٰٓفّٰت 37:65)۔ اب چونکہ ہم میں سے کسی نے نہ تو کبھی شیطانوں کو

دیکھا ہے نہ ہی ان کے سروں کو کہ وہ کیسے ہوتے ہیں، اس تشبیہ کا وہ درست تصور حاصل کرنے کے لیے جس سے ہم زقوم کی کراہیت کا صحیح اندازہ کر سکیں، ہماری قوت تخیل بدحواس ہو جاتی ہے اور کراہیت بھی اس درجہ کی جو ہمیں اس زمین پر موجود کسی بری سے بری شے سے آسکتی ہے۔ یہ جدید قسم کی تشبیہ ان تمام رکاوٹوں کو گرا کر (جو ایک عقلی اور دلیل پر مبنی تشبیہ ہماری پرواز تخیل کے سامنے کھڑی کر دیتی ہے) ہماری فکر کو رنگوں اور تخیلات کے ایک لامحدود افق سے روشناس کرا دیتی ہے۔ اسی تناظر میں اب میرے ساتھ مندرجہ ذیل آیات کا اپنے تصور، حسیات اور ذاتی جذبات کے ساتھ قدم بہ قدم ایسا لطف لینے کی کوشش کریں جو آپ کے وجود میں اندر تک سرایت کر جائے۔

لَّا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ (سورہ الانعام 6:103)

(''نگاہیں اس کا احاطہ نہیں کر سکتیں اور وہ سب نگاہوں کا احاطہ کیے ہوئے ہے'')۔

يَوْمَ تُبَدَّلُ الْأَرْضُ غَيْرَ الْأَرْضِ وَالسَّمَاوَاتُ (سورۃ ابراہیم 14:48)

(''جس دن (یہ) زمین دوسری زمین سے بدل دی جائے گی اور تمام آسمان بھی بدل دیئے جائیں گے'')۔

وَأَصْبَحَ فُؤَادُ أُمِّ مُوسَى فَارِغاً (سورۃ القصص 28:10)

(''اور موسیٰ (علیہ السلام) کی والدہ کا دل (صبر سے) خالی ہو گیا'')۔

وَلَوْ أَنَّمَا فِي الْأَرْضِ مِن شَجَرَةٍ أَقْلَامٌ وَالْبَحْرُ يَمُدُّهُ مِن بَعْدِهِ سَبْعَةُ أَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمَاتُ اللَّهِ (سورۃ لقمٰن 31:27)

(''اور اگر زمین میں جتنے درخت ہیں (سب) قلم ہوں اور سمندر (روشنائی ہو) اس کے سات اور سمندر اس روشنائی کو بڑھاتے چلے جائیں (تب بھی) اللہ کے کلمات ختم نہیں ہوں گے۔

اسے بڑھاتے چلے جائیں تو اللہ کے کلمات (تب بھی) ختم نہیں ہوں گے'')۔

وَالْأَرْضُ جَمِيعاً قَبْضَتُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَالسَّمَاوَاتُ مَطْوِيَّاتٌ بِيَمِينِهِ (سورۃ الزمر 39:67)

(''اور ساری کی ساری زمین قیامت کے دن اس کی مٹھی میں ہوگی اور سارے آسمانی کرّے اس کے دائیں ہاتھ (یعنی قبضۂ قدرت) میں لپٹے ہوئے ہوں گے'')۔

فَإِذَا انشَقَّتِ السَّمَاء فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ (سورۃ رحمٰن 55:37)

(''پھر جب آسمان پھٹ جائیں گے اور جلے ہوئے تیل کی طرح گلابی (سرخ) ہو جائیں گے'')۔

وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَاء الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ وَجَعَلْنَاهَا رُجُوماً لِّلشَّيَاطِينِ (سورۃ ملک 67:5)

(''اور بے شک ہم نے سب سے قریبی آسمانی کائنات کو (ستاروں، سیاروں کی شکل میں) چراغوں سے مزین فرمادیا ہے اور ہم نے ان (ہی میں سے بعض) کو شیطانوں کو مار بھگانے کا ذریعہ بھی بنایا ہے'')۔

وَإِن يَكَادُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَيُزْلِقُونَكَ بِأَبْصَارِهِمْ (سورۃ القلم 68:51)

(''اور کافر لوگ (قرآن سنتے وقت) ایسا لگتا ہے کہ آپ کو اپنی (بد) نظروں سے تہہ وبالا کردینا چاہتے ہیں'')۔

(سورۃ المدثر 74) میں پائی جانے والی منظر کشی کی قسمیں

اگر سورۃ المدثر پر ایک مرتبہ پھر نظر ڈالیں تو ہم دیکھیں گے کہ اس میں اوپر بیان شدہ اقسام کی کم از کم 31 تمثیلات موجود ہیں۔ یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ یہ قرآنی تمثیلات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے عربوں کے لیے بالکل نئی تھیں، اور ان میں وہ دونوں طرح کی تمثیلات تھیں جن میں سے بعض ان ارکان وعناصر پر مبنی تھیں جو زمانہ قبل اسلام میں معلوم ومعروف تھے، اور وہ بھی جو جدت میں اگلے زمانوں کا پتہ دے رہے تھے۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ جو تکنیکی، بیانیہ درجہ بندی ہم نے ان تمثیلات کی کی ہے وہ قطعی اور آخری نہیں ہے۔ یہ اس لیے کہ جیسا ہم نے دوسرے مواقع پر اوپر کی بحث میں بھی دیکھا ہے کہ بہت سی قرآنی تمثیلات کسی بھی درجہ بندی کے ان اصولوں سے ماوریٰ ہیں جو عربی خطابت وبیان کے علماء نے مقرر کیے ہیں۔ جدول 4 میں ایسی منظر کشی کی مثالیں شامل ہیں۔

جدول 4:

تمثیل	اردو ترجمہ	آیت	فن خطابت کے لحاظ سے درجہ بندی
وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ	اور اپنے (ظاہر و باطن کے) لباس پاک رکھیں	4	استعارہ (لفظ لباس کو باطنی وجود کے لیے استعمال کیا گیا ہے)
سَأُرْهِقُهُ صَعُوداً	عنقریب میں اسے سخت مشقت (کے عذاب) کی تکلیف دوں گا	17	اشاراتی زبان جس میں نام دیئے بغیر سخت مشقت کا ذکر جس کی نوعیت نامعلوم ہے
ثُمَّ أَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ	پھر (حق سے) پیٹھ پھیر لی اور تکبر کیا	23	اشارہ جس میں ''پیٹھ پھیر لی'' کلمہ کو انکار اور رد کی مثال لیا گیا ہے
كَفَرُوا	جو حق سے انکار کی طرف مائل ہیں (چھپا رہے ہیں)	31	ایک استعارہ جس میں حق سے انکار کو کچھ چھپانے سے مثال دی گئی ہے (فعل كَفَرَ کے بنیادی معنی ذہن میں چھپائے رکھنا ہے)
يُضِلُّ اللَّهُ مَن يَشَاءُ	اللہ اسے گمراہ ہونے دیتا ہے جو (گمراہ ہونا) چاہتا ہے	31	ایک مثال جس میں ایمان نہ لانے والے کو جان بوجھ کر غلط راستہ پر ڈالنے سے ملایا گیا ہے۔
وَيَهْدِي مَن يَشَاءُ	جسے چاہتا ہے ہدایت فرماتا ہے	31	ایک مثال جس میں ایمان لے آنے کے عمل کو کسی کو سیدھے راستہ کی طرف ہدایت دینے سے ملایا ہے
وَالصُّبْحِ إِذَا أَسْفَرَ	اور صبح کی قسم جب وہ روشن ہو جائے	34	ایک تمثیل جس میں صبح کے طلوع ہونے کو رات کا پردہ چاک کرنے سے تشبیہ دی گئی ہے (لفظ أَسْفَرَ کے معنی ہی پردہ چاک کرنا ہے)

كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ	ہر شخص ان (اعمال) کے بدلے میں جو اس نے کیے ہیں گروی ہے	38	ایک تمثیل جس میں انسان کو ایسے فرد سے مشابہ قرار دیا گیا ہے جو اپنے جرائم کی سلاخوں کے قید خانہ میں ہو۔
أَصْحَابَ الْيَمِيْنِ	(لغوی معنی سیدھے ہاتھ والے) یعنی نیکوکار لوگ	39	ایک کنایہ جس سے نام لیے بغیر بالواسطہ اہل جنت کی طرف اشارہ ہو۔
اَلتَّقْوَى	خوف خدا	56	ایک کنایہ یا اشارہ جو اللہ تعالیٰ کی سزا کا خوف ظاہر کرے (اسم تَّقْوَى بنیادی فعل و، ق، ی، سے بنا ہے جس کے معنی ہیں کسی نقصان دہ چیز سے بچنے کی کوشش کرنا)

الالتفات (طرزِ خطاب کی تبدیلی):

ایک لسانی فن جو صرف قرآن کے ساتھ مخصوص ہے۔

ماہرین خطابت نے اکثر ایک لسانی رجحان پر بحث کی ہے جس کی وہ 'مطالب متن' کے عنوان کے تحت درجہ بندی کرتے ہیں۔ اسی رجحان کو 'التفات' کا نام دے دیا گیا ہے، جو تقریر میں اچانک کسی تغیر کی نشاندہی کرتا ہے۔ ادبی حوالہ سے التفات کسی مصنف یا مقرر کے انداز بیان میں کسی غیر متوقع تبدیلی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ مثلاً واحد یا جمع غائب کے صیغہ سے اچانک واحد یا جمع، مخاطب، کی طرف مراجعت، یا مخاطب سے متکلم کی طرف مراجعت (یعنی ''وہ'' سے تو، تم یا تم سے میں یا ہم کی طرف تبدیلی)، یا واحد سے جمع کی طرف تبدیلی۔ بعض خطیب زمانہ ماضی کو زمانہ حال یا حکمیہ جملہ میں تبدیلی، اسم کی فعل میں تبدیلی وغیرہ کو بھی التفات ہی مانتے ہیں۔ مثال کے طور پر درج ذیل آیت میں ہمیں صیغہ واحد سے جمع کی طرف تبدیلی نظر آتی ہے:

بَلَى مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهُ أَجْرُهُ عِندَ رَبِّهِ وَلاَ خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلاَ هُمْ يَحْزَنُونَ ''ہاں، کیوں نہیں: جس کسی نے اللہ تعالیٰ کے سامنے مکمل سپردگی (بندگی، تابعداری) پیش کر دی اور وہ شخص نیکوکار ہے، اپنا بدلہ اپنے مالک کے پاس پائے گا (واحد) نہ ہی وہ (جمع) خوف زدہ ہوں گے، اور نہ ہی وہ (جمع) رنجیدہ ہوں گے (سورۃ بقرہ 2:112)۔ یہ آیت شروع تو واحد، غائب کے صیغہ سے ہوتی ہے لیکن آخر میں جمع غائب (وہ سب) کا صیغہ استعمال کرتی ہے، حالاں کہ مخاطب پوری آیت کے دونوں حصوں میں وہی لوگ ہیں۔

اس رجحان کی مثالوں پر نظر دوڑاتے ہوئے عرب ماہرین کلام نے بدقسمتی سے قرآنی آیات اور قبل اسلام کی شاعری کے مصرعوں میں کوئی فرق ملحوظ نہیں رکھا ہے۔ چلئے، ہم یہ بات تو تسلیم کر لیتے ہیں کہ انھوں نے التفات کی مثالوں میں قرآنی آیات کو قدیم شاعرانہ مصرعوں کی نسبت زیادہ جگہ دی ہے۔ یہ امر بذات خود قرآن کی اس لحاظ سے برتری کا بالواسطہ اعتراف ہے۔ اس معمولی اعتراف سے قطع نظر، اگر علمی زبان میں گفتگو کی جائے تو قدیم شاعری کے ان مصرعوں کی یہ حیثیت ہی نہیں ہے کہ انہیں اس رجحان کی مثالوں کا مطالعہ کرنے کے لیے قرآن کی آیتوں کے قریب تک پھٹکنے دیا جائے۔ اپنی کتاب 'مفتاح العلوم' میں مصنف السکاکی نے علقمہ الفحل (وفات 603ء)[18] کی شاعری کی دوسطور کا باب التفات (ص 298) میں حوالہ دیا ہے:

طحابک قلبٌ فی الحسان طروب
بعید الشباب عصر حان مشیب
(تیرا منچلا جوان دل اب بھی مہ لقاؤں پر مرمٹتا ہے
ہر چند کہ جوانی چلی گئی ہے اور بڑھاپا آ گیا ہے)
یکلفنی لیلی وقد شطہ ولیھا
وعادت غورد بیتا وخطوب
(وہ (میرا دل) مجھ سے لیلیٰ کے قرب کا تقاضہ کرتا ہے
اور مصروفیات، رکاوٹیں اور ہجر ہمارے درمیان آ گئے ہیں)

یہاں میرا سوال یہ ہے: کیا ان مصرعوں میں ہمیں کسی بھی قسم کا التفات، یا کوئی اور ایسی چیز جس کا التفات سے دور کا بھی کوئی تعلق ہو، نظر آتی ہے؟ سب کا تو نہیں لیکن ادیبوں کی اکثریت کا اصرار یہی ہے کہ ''جی ہاں! کوشش کریں تو نظر آسکتی ہے''۔ بہرنوع، حقیقت تو یہ ہے کہ ان مصرعوں میں سوائے خود کلامی کی کیفیت کے، کوئی اور قابل لحاظ بات نہیں ہے۔

جیسا کہ شعراء کے یہاں بھی اور عام لوگوں میں بھی یہ رواج ہے۔ علقمہ خود اپنے آپ کو دوسرے شخص یعنی 'مخاطب' کے طور پر پیش کرتا ہے، جیسے کوئی اور سامنے بیٹھا ہو اور وہ اس سے باتیں کر رہا ہو (اردو شاعری میں بھی غالب، میر، مومن وغیرہ جیسے بڑے شاعروں میں بھی اور کم درجہ کے شعراء کے کلام میں بھی اس طرح کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ مترجم)۔ پھر وہ (علقمہ) خود اپنی طرف مراجعت کرتا ہے اور واحد متکلم (میں) کے صیغہ میں کلام کرنے لگتا ہے۔ کتنی ہی مرتبہ ہم اپنے آپ سے اسی طرح باتیں کرتے ہیں! مثال کے طور پر میں کہتا ہوں، ''بسام، تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ تم جو کر رہے ہو میں اس سے مطمئن نہیں ہوں۔ اچھا، تو میں اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کئے لیتا ہوں۔ ہاں، یہ تمہارے لیے بہتر ہے بسام''۔ اس خود کلامی میں، کئی مرتبہ میں مخاطب (تم) اور واحد متکلم (میں) کی جگہ بدل بدل کر بات کرتا ہوں۔ لیکن کیا اس عمل کو میں بجا طور پر 'التفات' کہہ سکتا ہوں؟ اور کیا مجھے یہ حق حاصل ہو جائے گا کہ میں اِس مکالمہ کو اُس قرآنی ہنر کے تقابل میں پیش کر دوں، جسے 'التفات' کے عنوان سے جانا جاتا ہے؟

قرآن شریف میں 'التفات' ایک بالکل جدید فن کے طور پر نمودار ہوا ہے جو قبل اسلام کے عربی ادب میں بھی ناپید تھا، اور اب بھی عنقا ہے۔ آج تک یہ حال ہے کہ اس طرز کی نقالی کسی انسانی مصنف کی دسترس سے قطعاً باہر ہے اور اس میں دنیا کی کسی بھی زبان میں کم از کم میری معلومات کی حد تک کوئی مثال نہیں ملتی۔ قرآن میں بھی یہ طرز محض اتفاقیہ طور پر خال خال ظہور پذیر نہیں ہوتا۔ بلکہ درحقیقت یہ ایک ایسا منفرد طرز اور رجحان ہے جس میں صرف قرآن کو درجہ تخصص حاصل ہے۔ جب میں التفات کو ایک ''رجحان'' کے طور پر پیش کرتا ہوں تو اس سے میری مراد اس کثیر تعداد کی اہمیت واضح کرنا ہے جس میں یہ فن پورے قرآن میں مختلف شکلوں میں موجود ہے۔ ایک اور قابل لحاظ نکتہ ضمیروں کا بدل بدل کر استعمال غیر معمولی خوبی کا حامل ہے

جو اپنے قاری کو مستقل سوچنے پر مجبور کرتا ہے اور اس عمل میں ذہن کو خاصی کوشش صرف کرنا پڑتی ہے کہ تیز رفتاری سے مختلف صیغات کی تبدیلی جیسے میں، ہم، تو، تم، وہ (واحد) وہ (جمع) وغیرہ کو ارتکازِ توجہ کے ساتھ گرفت میں لے سکے۔

جیسا کہ ہم درج ذیل مثال میں دیکھیں گے، اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے لیے ضمیر اور اسم نکرہ ''میں،'' ''وہ'' اور ''ہم'' سورہ اَسرا (17:1-3) کی ابتدائی تین آیات میں کم از کم چھ مرتبہ تبدیل ہوئے ہیں:

سُبْحَانَ الَّذِیْ أَسْرَی بِعَبْدِہِ لَیْلاً مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ إِلَی الْمَسْجِدِ الأَقْصَی الَّذِیْ بَارَکْنَا حَوْلَہُ لِنُرِیَہُ مِنْ آیَاتِنَا إِنَّہُ ھُوَ السَّمِیْعُ البَصِیْرُ (1) وَآتَیْنَا مُوسَی الْکِتَابَ وَجَعَلْنَاہُ ھُدًی لِّبَنِیْ إِسْرَائِیْلَ أَلَّا تَتَّخِذُواْ مِن دُونِیْ وَکِیْلاً (2) ذُرِّیَّۃَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ إِنَّہُ کَانَ عَبْداً شَکُوراً (3)

(1) وہ ذات (ہر نقص اور کمزوری سے) پاک ہے جو رات کے تھوڑے سے حصہ میں اپنے (محبوب اور مقرب) بندے کو مسجد حرام سے (اس) مسجد اقصیٰ تک لے گئی جس کے گرد و نواح کو ہم نے بابرکت بنا دیا ہے تاکہ ہم اس (بندہ کامل) کو اپنی نشانیاں دکھائیں، بے شک وہی خوب سننے والا، خوب دیکھنے والا ہے۔

(2) اور ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو کتاب (توریت) عطا کی اور ہم نے اسے بنی اسرائیل کے لیے ہدایت بنایا (اور انہیں حکم دیا) کہ تم میرے سوا کسی کو کارساز نہ ٹھہراؤ۔

(3) (اے) ان لوگوں کی اولاد جنہیں ہم نے نوح (علیہ السلام) کے ساتھ (کشتی میں) اٹھا لیا تھا، بے شک وہ (نوح) (ہمارے) بڑے شکر گزار بندے تھے۔

وقت کے تعلق سے التفات (طرزِ خطاب کی تبدیلی)

قرآنی فن التفات کی بے شمار قسمیں ہیں جن میں سے ایک وہ ہے جس میں تینوں زمانے ماضی، حال اور مستقبل ایک ہی زمانہ میں مدغم ہو جاتے ہیں۔ یہاں ہمارا سابقہ زمان

ومکان کی ان ماورائی جہتوں سے پڑتا ہے جو ہم انسانوں کی متعین کردہ جہتوں کے دائرہ میں رہنے سے صاف انکار کر دیتی ہیں۔ قرآنی بیانات اور کلمات اکثر و بیشتر کسی ایک زمانہ میں محدود نہ رہ کر، ایک سے دوسرے میں، دوسرے سے تیسرے میں اور تیسرے سے پہلے میں حرکت پذیر رہتے ہیں اور اس عمل میں ہمارے ارضی اصولوں اور معمولات کا قطعاً کوئی لحاظ نہیں رکھا جاتا۔ قرآن کریم کی درج ذیل آیات ہمیں اس طرز کلام کو سمجھنے میں مدد دیں گی جس میں مختلف زمانوں کی حدود غیر واضح ہو کر ایک دوسرے میں پیوست ہو جاتی ہیں:

وَلَوْ تَرَىٰ إِذْ وُقِفُوا عَلَى النَّارِ فَقَالُوا يَا لَيْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبَ بِآيَاتِ رَبِّنَا

''اگر آپ (انہیں اس وقت) دیکھیں جب وہ آگ (کے کنارے) پر کھڑے کیے جائیں گے تو کہیں گے ہائے ہماری بدبختی، کاش! ہم (دنیا میں) پلٹا دیئے جائیں تو ہم اپنے رب کی آیتوں کو (کبھی) نہیں جھٹلائیں گے.....(سورۃ الانعام 6:27)

اگرچہ کہ مندرجہ بالا پیرا میں مستقبل میں پیش آنے والے قیامت کے دن کا ذکر ہے، لیکن ان واقعات کو بیان کرنے کے لیے زمانہ ماضی استعمال کیا گیا ہے۔

وَكَذَٰلِكَ نُرِي إِبْرَاهِيمَ مَلَكُوتَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ''اور اسی طرح ہم نے ابراہیم (علیہ السلام) کو آسمانوں اور زمین کی تمام بادشاہتیں (یعنی عجائباتِ خلق) دکھائیں (سورۃ الانعام 6:75)

یہ پیرا اللہ تعالیٰ کا ایک ماضی میں کیا ہوا عمل بیان کر رہا ہے، لیکن زمانہ حال کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔

وَيَصْنَعُ الْفُلْكَ وَكُلَّمَا مَرَّ عَلَيْهِ مَلَأٌ مِّن قَوْمِهِ سَخِرُوا مِنْهُ

''اور نوح (علیہ السلام) کشتی بناتے رہے اور جب بھی ان کی قوم کے سردار ان کے پاس سے گزرتے (تو) ان کا مذاق اڑاتے'' (سورۃ ھود 11:38)

ماضی میں کیا گیا نوح (علیہ السلام) کا عمل، فعل حال استعمال کرتے ہوئے بیان ہوا ہے جب کہ دوسروں کا اسی وقت کیا گیا عمل فعلِ ماضی میں بیان کیا گیا ہے۔

مفعول کی حالت میں التفات (طرزِ خطاب کی تبدیلی)

اگرچہ کہ قرآنی التفات کی بہت سی قسمیں ہیں، لیکن ان میں سے جو سب سے زیادہ نمایاں اور قابل توجہ ہے، میں اسے ''صرفی ونحوی التفات'' کا نام دینا چاہوں گا۔ اس قسم کا التفات خاص طور پر ان حالات میں ظہور پذیر ہوتا ہے، جن میں مفعول بالکل غیر متوقع طور پر یا غیر متوقع جگہ پر استعمال کیا گیا ہو۔ اس طرح کی تمام صورتوں میں بے شمار ماہرین صرف ونحو سخت پریشان ہو جاتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے التفات اور دوسری قرآنی لسانی جہتوں کو بھی صرف ونحو کے مسلم اصولوں کی کسوٹی پر پرکھنے کی کوشش کی ہے اور اپنی اس کوشش میں ناقص انسانی اصولوں کی ناکامی پر جھنجھلا کر بعض اوقات زیر بحث آیت کے اصل معنی تک سے دور ہٹ جاتے ہیں۔ تو ایسی صورت حال میں جب تک ماہرین صرف ونحو ایسے نئے اصول وضع کرنے کے قابل ہو سکیں (جو میں نہیں سمجھتا کبھی ہو سکیں گے) جو اس قسم کے مفعول کی تشریح کر سکیں اور اسے کوئی مستقل علمی نام عطا کر سکیں، میں گزارش کروں گا کہ صرف ونحو کی بھول بھلیوں میں بھٹکنے کے بجائے اس طرز کو محض قرآنی مفعول یا ''التفات پر مبنی مفعول'' کے نام سے اس طرز کی درجہ بندی کر لی جائے۔ اب رہے وہ متعصب مستشرقین جو دعویٰ کرتے ہیں کہ ان مفعولات کا غیر متوقع اور غیر قدامت پرستانہ قرآنی استعمال دراصل ''غلطی'' ہے، تو ان لوگوں اور ان جیسے دوسرے ناقدین کے دعویٰ کی نفی کے لیے درج ذیل ملاحظات پیش کرنے کی جسارت کرنا چاہوں گا:

(1) قرآن کریم عربی صرف ونحو کے اصولوں کے وضع ہونے سے پہلے نازل ہوا ہے۔ درحقیقت یہ کہنا زیادہ بجا ہوگا کہ یہ قرآن ہی تھا جس نے ماہرین صرف ونحو، ماہرین زبان اور خطباء کو تحریک دی کہ وہ عربی صرف ونحو کے وہ اصول وضع کریں جو اب ہمیں میسر ہیں اور اگر قرآن ایسی فصیح وبلیغ عربی زبان میں نازل نہ ہوا ہوتا تو علماء کے لیے یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ عربی زبان کی زندگی کے اس ابتدائی دور میں ایسے قوانین بنانے کے اہل ہو سکتے۔ حاصلِ کلام یہ کہ عربی صرف ونحو کو قرآن کے معیار واصولوں پر پورا اترنا ہے نہ کہ قرآن کو انسانی زبان کے معیار اور اصولوں پر۔

(2) ہمارے کم نظر مستشرقین دوستوں کے مطابق قرآن کریم نبی اکرم محمد مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تصنیف ہے اور اس میں انھوں نے صرف ونحو کی غلطیاں کی ہیں، تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسی قسم کی غلطیاں انھوں نے اپنی روزمرہ کی گفتگو میں کیوں نہیں کیں جو ہمیں حدیث شریف کی صورت میں پہنچی ہے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ آنحضرت بمقابلہ قرآن کی زبان کے، اپنی عام روزمرہ زندگی کی زبان بولتے وقت اپنی اغلاط کو درست کرنے کا زیادہ اہتمام کرتے ہوں، جب کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال، جو حدیث کی شکل میں محفوظ ہو کر ہمیں ملے ہیں، اپنے حجم میں قرآن کے مقابلہ میں دسیوں گنا زیادہ ہیں اور یہ وہ الفاظ ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آس پاس موجود لوگوں سے عام بات چیت کے موقعوں پر بے ساختہ ادا کئے ہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی سمجھ میں آنے والا دعویٰ ہوسکتا ہے کہ ایک شخص جب فی البدیہہ بات چیت یا تقریر کر رہا ہو تو اس کی زبان بے عیب اور غلطیوں سے مبرا ہو، اور جب وہی شخص تنہائی میں، پوری توجہ اور سکون سے ایسی عبارت تحریر کر رہا ہو جسے وہ بعد میں لوگوں کے سامنے خدائی کلام کہہ کر پیش کرنے کا ارادہ رکھتا ہو، تو اس میں غلطیوں کی بھرمار ہو؟

(3) اگر قرآنی زبان میں فی الواقع غلطیاں ہوتیں تو کیا صحابہ کرام جو عربی زبان کی شاعری اور سلاست زبان کے رمز شناس تھے، یہ کوشش نہ کرتے کہ ان غلطیوں کو درست کر کے ایک ایسا جامع قرآن اپنے ہم عصر اور بعد میں آنے والے انسانوں تک پہنچانے کا بندوبست کرتے جس میں ایک بھی غلطی نہ ہو۔ اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ کیا صحابہ کرام زبان کی ان غلطیوں کو جانتے اور مانتے ہوئے بھی ایک نئے مذہب کو قبول کر لیتے جس کا خدا تحریر وتالیف کے بنیادی اصولوں کی پاسداری کرنے تک کا اہل نہیں ہے؟

(4) محض بحث کی خاطر چلئے اگر ہم فرض کرلیں کہ واقعی قرآن میں غلطیاں ہیں، تو بھی یہ بات ذہن میں رکھنا چاہیے کہ صرف ونحو کے 'التفات' کی بے شمار مثالوں میں جو قرآن میں ہیں، جملۂ اسمیہ کے کسی لفظ کو جو فاعل ہونا چاہیے تھا اور جس پر ''پیش'' (یا عربی

میں ضمہ) آنا چاہیے تھا، اسے 'زبر' (عربی میں فتح) لگا کر پیش کیا گیا ہے، جیسے الشمس مشرقة، زبر کے ساتھ حالاں کہ اس قسم کی غلطیاں تو اتنی واضح اور فاش ہیں کہ عربی زبان کا ایک مبتدی طالب علم بھی کسی حالت میں ایسی غلطیاں نہیں کرے گا۔ فاعل کو مفعول کی شکل میں استعمال کی چند مثالیں ذیل میں دی جاتی ہیں:

☆ خَالِدِيْنَ فِيْهَا أَبَداً وَعْدَ اللّٰهِ حَقّاً: ''وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ (یہ) اللہ کا سچا وعدہ ہے۔ (سورۃ نساء 4:122) یہاں لفظ ''وعدہ'' فاعل ہونے کی وجہ سے پیش کے ساتھ ہونا چاہیے تھا، زبر کے ساتھ نہیں جو مفعول کی نشانی ہے، ''خدا کا وعدہ سچا ہے''۔

☆ فَإِنَّهُ رِجْسٌ أَوْ فِسْقاً أُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهِ ''کیونکہ وہ ناپاک ہے یا نافرمانی کا جانور جس پر ذبح کے وقت غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو'' (سورہ الانعام 6:145) لفظ 'فسق' جس کے معنی ''نافرمانی کا جانور'' اس جگہ کیے گئے ہیں، زبر (فتح) کے ساتھ ہے جب کہ اسم 'رجس' ''ناپاک'' پیش کے ساتھ (ضمہ کے ساتھ) ہے حالاں کہ دونوں الفاظ ایک ہی جملہ اسمیہ کا حصہ ہیں۔

☆ وَلَقَدْ جَاءَتْ رُسُلُنَا إِبْرَاهِيْمَ بِالْبُشْرَى قَالُوْا سَلاَماً قَالَ سَلاَمٌ ''اور بے شک ہمارے فرستادہ فرشتے ابراہیم (علیہ السلام) کے پاس خوشخبری لے کر آئے، انہوں نے سلام کہا، ابراہیم نے بھی (جواباً) سلام کہا'' (سورۃ ہود 11:69) یہاں پہلی مرتبہ لفظ 'سلام' زبر کے ساتھ مفعول کی شکل میں، اور دوسری مرتبہ یہی لفظ پیش کے ساتھ فاعل کی شکل میں ہے، حالاں کہ عربی قواعد کی رو سے دونوں جملوں کی بناوٹ ایک جیسی ہے۔

☆ ذٰلِكَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ قَوْلَ الْحَقِّ:
''مریم کے بیٹے عیسیٰ علیہ السلام ایسے (تھے) یہی سچی بات ہے''۔ (سورۃ مریم 19:34)

اس آیت میں لفظ 'قول' عام قاعدہ کی رو سے پیش کے ساتھ آنا چاہیے تھا لیکن زبر کے ساتھ ہے۔

☆ إِنَّ هَذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً:

''بے شک، یہ تمہاری ملت (سب) ایک ہی ملت ہے'' (اہل ایمان کی) (سورۃ الانبیاء 21:92)

جملہ اسمیہ کا حصہ ہونے کی وجہ سے ''کلمہ'' ایک ہی ملت (أُمَّةً وَاحِدَةً) عام قاعدہ کے لحاظ سے 'پیش' کے ساتھ ہونا چاہیے تھا، لیکن 'زبر' کے ساتھ آیا ہے۔

☆ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ مِّلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ ''اور اس نے تم پر دین میں کوئی تنگی نہیں رکھی۔ (یہی) تمہارے باپ ابراہیم علیہ السلام کا دین ہے''۔ (سورۃ الحج 22:78)

لفظ 'مِّلَّةَ' یہاں پیش کے ساتھ متوقع تھا لیکن زبر کے ساتھ آیا ہے۔

☆ سَلَامٌ قَوْلاً مِن رَّبٍّ رَّحِيمٍ:

تم پر سلام ہو! (یہ) رب رحیم کی طرف سے فرمایا جائے گا'' سورۃ یٰسین 36:58)

لفظ 'قَوْلاً' پیش کے ساتھ متوقع تھا مگر زبر کے ساتھ ہے۔ درج ذیل پیرا کی مثالوں میں جو الفاظ خط کشیدہ ہیں، ان سب میں بھی یہی حقیقت کارفرما ہے۔

☆ كَلَّا إِنَّهَا لَظَى. نَزَّاعَةً لِّلشَّوَى:

''ایسا ہرگز نہ ہوگا، بے شک وہ شعلہ زن آگ ہے سر اور تمام اعضائے بدن کی کھال اتار دینے والی ہے'' (سورۃ المعارج 70:15-16)

☆ وَمِزَاجُهُ مِن تَسْنِيمٍ. عَيْناً يَشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُونَ:

''اور اس (شراب) میں آب تسنیم کی آمیزش ہوگی (یہ تسنیم) ایک چشمہ ہے جہاں سے صرف اہل قربت پیتے ہیں۔ (سورۃ المطففین 83:27-28)

☆ سَيَصْلَى نَاراً ذَاتَ لَهَبٍ. وَامْرَأَتُهُ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ:

''عنقریب وہ شعلوں والی آگ میں جا پڑیگا، اور اس کی (بدخصلت) بیوی (بھی) جو (کانٹے دار) لکڑیوں کا بوجھ (سر پر) اٹھائے پھرتی ہے (یہ عربی محاورہ ہے جس کے معنی ہیں لوگوں میں فساد کے لیے لگائی بجھائی کرتی پھرتی ہے۔ مترجم) (سورۃ اللھب 111:3-4)

اخیر میں اس بحث کو سمیٹتے ہوئے میں کہنا چاہوں گا کہ نزولِ قرآن کی بالکل ابتدائی مختصر سی سورۃ المدثر میں ہی پندرہ مختلف طرح کے ''التفات'' کی موجودگی اس بات کا بین ثبوت ہے کہ قرآن میں پائے جانے والے بہت سے نئے لسانی رجحانات میں ''التفات'' کس قدر اثر انگیز اور اہمیت کا حامل ہے۔ اسی حوالہ سے ہم اس زبردست صدمہ کا اندازہ لگا سکتے ہیں جو قرآن کے اسلوب نے اس وقت کے عربوں کی لسانی اور خطیبانہ صلاحیت کو پہنچایا ہوگا جب انھوں نے پہلے پہل یہ معجزاتی کلام سنا ہوگا۔

وسعتِ زبان ومطالب

قرآن کریم نے اپنی نئی طرز کی زبان سے، جس میں تعجب کے کئی پہلو تھے، اور پھر بھی تمام پہلو ایک دوسرے سے قطعی مطابقت رکھتے تھے، پیغمبر اسلام ﷺ کے زمانہ کے عربوں کو حیران کر دیا۔ اس آسمانی زبان میں ایک معجزاتی لچک تھی جس کی وجہ سے اس زبان میں آنے والے زمانوں میں بھی زندہ، اور تروتازہ رہنے کی صلاحیت کچھ اس طرح موجود تھی کہ ہر آنے والا زمانہ اور نئی نسل اس زبان کے ایسے نئے نئے معنی دریافت کرتی تھی جو ان کے قدیم آباء واجداد اپنے زمانہ کے حقائق اور محدود علم کی وجہ سے دریافت نہیں کر سکے تھے۔ اس نئی زبان کے معنی میں اسی لچک کے باعث ہر نئی نسل کے لوگوں اور غالباً ہر خطہ اور سماج کے لوگوں نے اپنے اپنے طرز فکر اپنی سماجی اور سائنسی دریافتوں اور جتنا کچھ علم بھی ان کو اس وقت میسر تھا، اسی کے مطابق قرآن کو سمجھا، مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی باک نہیں کہ خود مجھے حضرت عمر فاروقؓ کے اس حکم کی حکمت سمجھنے میں ایک طویل عرصہ لگا جس کے مطابق انھوں نے اپنے زمانہ کے لوگوں کو قرآنی آیات کی تفسیر وتاویل کرنے کی اجازت دینے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ حضرت عمرؓ اس رائے پر اس قدر

سختی سے قائم تھے کہ نافرمانی کرنے والوں کو مختلف طرح کی سزاؤں، کوڑوں اور قید و بند کی صعوبتوں سے بھی گزرنا پڑا۔ حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ انھوں نے فرمایا: ''ہم لوگ حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر تھے کہ ایک شخص آیا اور اس نے پوچھا، اے امیر المؤمنین! الْجَوَارِ الْكُنَّسِ (سورۃ تکویر 81:16) کے کیا معنی ہیں؟ جواب میں حضرت عمرؓ نے اس شخص کی پگڑی پر اس زور سے تلوار ماری کہ پگڑی اڑ کر دور جا گری۔ پھر آپؓ نے فرمایا، ''کیا تم خارجی ہو؟'' اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں عمر ابن الخطاب کی جان ہے، اگر اس وقت تمہارے سر پر اس پگڑی کی حفاظت نہ ہوتی تو میں نے تمہارا سر قلم کر دیا ہوتا!''[19]

ہماری اپنی محدود عقل و سمجھ کے تناظر میں دیکھا جائے تو تاریخ کے اس زمانہ کی قرآنی تفسیر جس میں رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرامؓ اپنی زندگی گزار رہے تھے، ہمارے لیے ایک قیمتی خزانہ ہوتی، جس میں قرآنی زبان کے اسرار و رموز کھولنے کی سنہری کنجیاں ہوتیں۔ لیکن حضرت عمرؓ جیسے دور اندیش اور زیرک شخص کے لیے اس وقت تفسیر کی اجازت دینے کا مطلب یہ ہوتا کہ آنے والی صدیوں اور نسلوں کی وہ تفسیری صلاحیت بہت محدود ہو جاتی جس سے کام لے کر نئی نسلیں قرآن کے اسرار اور معجزات دریافت کرتیں۔ تب ہی تو پیغمبر اسلام رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ قرآن کے عجائبات کبھی بھی ختم نہیں ہوں گے (لا تنقضی عجائبه)، پھر بھلا صرف دوسری صدی ہجری کے کسی عالم میں یہ جرأت کہاں سے آتی کہ وہ کسی قرآنی آیت کی ایک نئی تفسیر پیش کرتا جو اس تفسیر سے مختلف ہوتی جو پہلی صدی ہجری میں حضرت عمرؓ جیسے جلیل القدر صحابی کے زمانہ میں حتمی طور پر قائم ہو چکی ہوتی۔ کیا جدید عالم کو نئی تفسیر پیش کرنے میں اور بھی تامل نہ ہوتا، اگر اسے معلوم ہوتا کہ حضرت عمرؓ کے علم میں بھی یہ تفسیر تھی، لیکن انھوں نے اس بارے میں خاموشی اختیار کی؟

آج کے دور میں جب ہم قرآن کی آیات کے گہرے اور کثیر الجہتی معنی و مطالب کی جدید سائنسی معلومات سے مطابقت دریافت کرتے ہیں جو ان حقائق سے متعلق ہیں جو ہمیشہ سے اس دنیا میں موجود تو تھے لیکن انسان کی کم علمی کی وجہ سے گزشتہ کئی صدیوں تک قرآن کی اس معجزاتی زبان کے سایہ میں پوشیدہ تھے، جس زبان کے بارے میں ہم یہاں بات کر رہے ہیں، لہٰذا، قرآنی زبان کے جدید مطالب کی دریافت کو جو قدیم معنی سے قطعی مختلف ہوتے ہوئے بھی

بالکل درست ہے، دراصل قرآنی معجزاتی زبان کے شجر ثمر دار کے متعدد پھلوں میں ایک پھل کہا جا سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ کتاب کی زبان کا ایک خاص وصف ہے۔ بالکل اسی طرح یہ بھی حقیقت ہے کہ آج کے زمانہ کی یہ دریافتیں اور جو مزید آنے والے زمانوں میں ہوں گی، اس انتہائی احتیاط کا ثمر بھی ہیں جو معزز صحابہ کرامؓ نے اس سلسلہ میں برتی کہ قرآن کے الہامی الفاظ تو جوں کے توں محفوظ رہیں لیکن اس وقت کے اخذ کردہ مفاہیم اور تاویلات آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ نہ ہوں۔

اپنے دامن میں متعدد معانی کے پہلو لیے ہوئے کئی الفاظ اور کلمات ہیں جو قرآن کی ان بہت سی آیات میں ملتے ہیں جنہیں ''متشابہات'' کہا جاتا ہے (مثلاً، سورۃ آل عمران کی آیت نمبر 3:7-7) بہرحال، اس طرح کے الفاظ ان آیات شریعہ میں نہیں ملتے جنہیں ''محکمات'' کہا جاتا ہے (یہ اپنے آپ میں بالکل صاف، واضح اور بنیادی نوعیت کے ہیں، جن میں ردوبدل نہیں ہوسکتا) اور ان مطالب کا تعلق اسلام کے بنیادی عقیدہ توحید سے ہے۔ مثلاً مفسرین قرآن سورہ اخلاص کی ایک کثیر الجہتی اصطلاح ''الصَّمَدُ'' کی تشریح میں تو اختلاف کر سکتے ہیں جس کے معنی کسی مفسر نے ''ازلی، جو ہمیشہ سے تھی اور جس نے پوری کائنات کو بغیر کسی نقشہ اور ساز وسامان کے محض اپنے حکم سے پیدا فرمادیا (علامہ اسد)، یا ازلی وابدی ہستی، اپنی ذات میں مکمل (عبداللہ یوسف علی)، لیکن الفاظ کے اختلاف کے باوجود یہ مفسرین اس لفظ ''الصَّمَدُ'' کی اصل روح 'وحدانیت' سے دور نہیں ہٹتے''۔ اب ذرا دوسری طرف ان دو الفاظ پر غور کیجئے جو ''الصَّمَدُ'' سے پہلے اور فوری بعد آئے ہیں''۔ یعنی اَحَدٌ (''ایک اللہ''، ''اکیلا اور یکتا)، لَمْ یَلِدْ (''نہ اس سے کوئی پیدا ہوا ہے'') وَلَمْ یُولَدْ (اور نہ ہی وہ پیدا کیا گیا ہے'')۔ ان الفاظ کے معنی ومطالب بیان کرنے میں کسی اختلاف رائے کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے، کیونکہ یہ الفاظ نظریۂ توحید کی جان ہیں اور کسی بھی زمانہ، مقام یا تہذیب کے اختلاف کے باوجود یہاں کسی بحث ومباحثہ یا رائے کے اختلاف کی اجازت نہیں ہے۔

قرآنی زبان کی ''وسعت'' کی تشریح کرنے کے لیے ایک سامنے کی مثال کلمہ 'اللہ اکبر' ہے۔ عموماً اس کا ترجمہ ''اللہ بڑا ہے'' یا ''اللہ سب سے بڑا ہے'' کیا جاتا ہے۔ پھر بھی یہ دونوں

مطالب کلمہ 'اللہ اکبر' کا مکمل اور بھرپور ترجمہ کرنے سے قاصر ہیں، کیونکہ لفظ 'اکبر' کا ترجمہ اردو میں ''زیادہ بڑا'' ہوگا، تو اس لحاظ سے 'اللہ اکبر' کا صحیح ترجمہ ''اللہ زیادہ بڑا ہے'' ہے، اب اس حقیقت کے باوجود کہ لسانی قواعد کی رو سے 'اللہ' کے بعد ایک اور اسم صفت مقابلہ کے لیے آنا چاہیے کہ ''اللہ.....سے زیادہ بڑا ہے'' لیکن اسلام نے اس کلمہ کو لامحدود ہی رہنے دیا ہے، تاکہ یہ کلمہ ادا کرنے والا یا والی، اپنے اپنے حالات و ماحول کی مناسبت سے خود تصور کر لے کہ اس خالی جگہ کو بہترین طریقہ پر کیا چیز پر کر سکتی ہے۔ جیسے ''اللہ ہر چیز سے، ہر رنج سے، ہر خوشی سے، ہر فکر سے، ہر لالچ سے، جذبہ یا خواہش سے، ہر ظالم و جابر وغیرہ وغیرہ سے بڑا ہے''۔ اگر کلمہ 'اَللّٰہُ الْاَکْبَرُ' یا 'اَللّٰہُ الْکَبِیْرُ' استعمال ہوتا تو اس کے معنی محدود ہو جاتے اور ہماری فکر کے لیے کوئی گنجائش نہ رہ جاتی۔ ایسے الفاظ و اصطلاحات سے بار بار سابقہ پیش آنے کی وجہ سے ہم ان کے اتنے عادی ہو چکے ہیں کہ اس عادت نے اس کلام کے خوبصورت پہلوؤں جدت، انفرادیت اور وسعت معنی کو ہماری نظر اور حسیات سے جدا کر دیا ہے۔ ہم اس عظیم کلمہ کو دہرا دہرا کر اس طرح عام طریقہ سے ادا کرتے ہیں جیسے اس کے معنی بس ''اللہ بڑا ہے'' ہی ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ اس عادت نے اس مبارک کلمہ کے بگڑے ہوئے اور خاص حد تک غلط معنی کو دوسری زبانوں میں رائج کر دیا ہے۔

کسی لفظ یا کلمہ کی بلاغت اور کثیر الجہتی کا پیمانہ وہ لہجہ ہوتا ہے جس سے وہ ادا کیا جاتا ہے، جتنے زیادہ لہجوں اور آواز کے زیر و بم کے ساتھ ایک لفظ ادا ہو سکتا ہو اس کی فصاحت، معنی آفرینی، تہہ داری اور شوخی بیان میں اسی قدر اضافہ ہو جاتا ہے۔ قرآن نے اپنے عہد کی اعلیٰ ترین نظم و نثر کے معیار کو پیروں تلے روند کر، ساتویں صدی عیسوی کے عربوں کو ایک ایسی زبان سے متحیر کر دیا جس زبان میں بدلتے ہوئے وقت، نت نئے واقعات و دریافتوں مختلف النوع شخصیات اور انسانی فکر، تہذیب و علم، میں ارتقاء کے تمام تقاضوں کا بھرپور مقابلہ کرنے کی سکت تھی۔ اسی وجہ سے لوگ اپنی مخصوص سمجھ، اور سماجی رویوں کے مطابق جو ان کے عہد، محل وقوع، ماحول، ذہنیت اور ضروریات سے زیادہ موافق ہوں، قرآن کی تعلیم سے حاصل کر لیتے ہیں۔ بہر نوع، کمال یہ ہے کہ چاہتے جتنے بھی متنوع حالات میں یا کسی بھی مسئلہ میں قرآن سے جواب طلب کیا جائے، قرآن کے وہی غیر متضاد مندرجات اسی معیاری تسلسل کے ساتھ ہمیں ہدایت

فراہم کرتے ہیں۔ اس طرح قرآن میں موجود معنی کے لحاظ سے پہلو دار الفاظ وکلمات کی وافر تعداد نے عربی ادب اور شاعری کو مالا مال کرنے میں ناقابل بیان اہم کردار ادا کیا ہے۔

اسی طرح کی وسیع المطالب زبان ہمیں قدیم آسمانی کتابوں، توریت اور انجیل شریف میں بھی آسانی سے مل جائے گی۔ پھر بھی ان کتابوں کے متن کی صحت کے بارے میں ہم وثوق سے فیصلہ نہیں کر سکتے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے خود کے الفاظ ہیں، کیونکہ فی الوقت جو عبارتیں اور بیانات ہمیں میسر ہیں وہ انسانوں کے بیان کردہ یا زیادہ سے زیادہ خود پیغمبروں کے بیان کردہ الفاظ میں ہیں۔ کہیں شاذ و نادر ہی ایسا ہوتا ہے کہ ہمیں کوئی ایسا بیان ملے جس میں اللہ تعالیٰ براہ راست خود مخاطب ہو (جیسے توریت میں کہیں کہیں ایسی آیات ہیں)۔ اس طرح ان پرانی کتابوں کے بیشتر مندرجات اللہ تعالیٰ کے اپنے ذاتی الفاظ میں نہیں ہیں۔ بہت سے بہت یہ مان سکتے ہیں کہ وہ مندرجات اللہ تعالیٰ کے الفاظ کے مطالب اور تشریح ہیں۔ ایک اور بات یہ بھی ہے کہ وہ مندرجات و بیانات ان زبانوں میں بھی ہمارے پاس نہیں ہیں جن زبانوں میں وہ اس وقت نازل ہوئے تھے۔ اس وجہ سے خواہ مترجمین نے کتنا ہی درست اور قریب الاصل ترجمہ کیا ہو، پھر بھی یہ ایک ذاتی تشریح و تفسیر ہی رہتی ہے جس میں مترجم کی اپنی رائے اور نقطۂ نظر کا کارفرما ہو سکتا ہے۔ اس پر مزید یہ بھی غور فرمائیے کہ اکثر تراجم خاصے مبہم ہوتے ہیں، خاص طور پر اس وقت جب مترجم اتنا دقیق النظر اور دیانتدار ہو کہ اس کا ضمیر یہ گوارا نہ کرے کہ وہ کتاب کے کسی غیر واضح حصہ کا، جس کا وہ خود اچھی طرح مطلب نہ سمجھا ہو بالکل صاف اور سیدھا ترجمہ کر سکے۔ ایسی صورت حال میں مترجم ایسا طرز تحریر اختیار کرتا ہے جو ترجمہ کو ابہام اور دھندلے مطلب سے بھر دیتا ہے جسے دیکھ کر ہم یہ غلط گمان کر سکتے ہیں کہ یہ ایک بلیغ اور کثیر المطالب بیان ہے حالاں کہ درحقیقت وہ ایک گنجلک بیان ہوتا ہے۔ آخری بات یہ کہ جس زبان کا ترجمہ کیا جا رہا ہو اس کے لسانی قواعد، الفاظ اور تہذیبی رویے دوسری زبانوں سے جن میں ترجمہ کیا جائے بہت مختلف ہوتے ہیں اور یہ اختلافات مترجم کے لیے ایک مشکل کھڑی کر دیتے ہیں۔

مثال کے طور پر ہم توریت کی ایک غیر واضح آیت ''تو نے اپنے دشمنوں کی وجہ سے قوت پائی ہے'' (سام 8:2)، اور جس کا عربی ترجمہ "**الست حمداً بسبب اضذدادک**"[20]

کیا گیا ہے، کو ایک کثیر المطالب زبان کا درجہ دینے میں تامل کریں گے کیونکہ عربی ترجمہ اپنے مزاج کی وجہ سے اردو کے مقابلہ میں اصل عبارت سے زیادہ قریب تر لگتا ہے۔ میں نے اس آیت کا عربی ترجمہ اس طرح کیا ہے، اور ظاہر ہے تمام تراجم کی طرح اس میں بھی خامی ہے، "**لقد أكسبك أعداؤك قوة**" (''تیرے دشمنوں نے تجھے قوت بہم پہنچائی ہے'')، جب کہ ایک اور عربی ترجمہ یوں کیا گیا ہے 'تعززتَ فی وجه خصومک'[21] (''تیرے دشمنوں کے چہرہ میں تجھے قوت دی گئی ہے'')، اور اس ترجمہ میں اوپر دیئے ہوئے پہلے ترجمہ کے مقابلہ میں کم ابہام ہے، لیکن پھر بھی اردو ترجمہ زیادہ صاف اور واضح ہے۔ قرآن کریم میں ہمیں یہ مسئلہ درپیش نہیں ہوتا جس میں شروع سے آخر تک اللہ سبحانہ وتعالیٰ واحد متکلم کے صیغہ میں گفتگو فرماتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ قرآن ہمارے پاس اس کی اصل زبان میں موجود ہے جس کی وجہ سے ہمیں اس کا مطلب سمجھنے کے لیے دوسری ایک یا دو زبانوں کا سہارا نہیں لینا پڑتا، جیسا کہ دوسری آسمانی کتابوں کا ترجمہ کرتے وقت ہمیں یہ مجبوری پیش آتی ہے۔

سورۃ المدثر میں ''وسعت زبان'' کی مثالیں

قرآن کریم میں پائے جانے والے بے شمار نئے لسانی رجحانات کے تجزیاتی مطالعہ میں ابھی تک ہم نے سورۃ المدثر (74) کو پیش نظر رکھا ہے۔ یہ سورۃ لسانی جدت طرازی کی بے شمار مثالیں پیش کرتی ہے جنہوں نے مبصرین، ماہرین لسانیت اور ماہرین صرف ونحو کے درمیان اصولی اختلافات اور مباحثہ کی داغ بیل ڈالی ہے، اور ان تمام مثالوں کی مختلف تشریحات وتفسیرات بھی ہوسکتی ہیں اور صرفی ونحوی تجزیے بھی کیے جاسکتے ہیں۔ مزید برآں، اگر ہم قرآن کریم کی تلاوت کے ان مختلف طریقوں کو بھی شامل مطالعہ کرلیں جو صدیوں سے بجا اور درست تسلیم کیے جارہے ہیں تو ہمیں کم از کم 29 مثالیں اس رجحان کی ملیں گی جنہیں میں ''وسعت الفاظ یا کلمات'' کہتا ہوں۔ نیچے دی ہوئی تختی نمبر 5 میں چند ایسے الفاظ دیئے گئے ہیں جن کے متعدد معانی میں سے صرف ایک ہی معنی لکھے گئے ہیں۔

تختی نمبر 5: کثیر المعانی الفاظ وکلمات کی چند مثالیں:

کثیر المعانی لفظ یا کلمہ	ترجمہ	آیت
قُمْ فَأَنذِرْ	اٹھیں اور (لوگوں کو اللہ سے) ڈرائیں	2
وَرَبَّکَ فَکَبِّرْ	اور اپنے رب کی بڑائی بیان فرمائیں	3
وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ	اور (گناہوں اور) بتوں سے الگ رہیں	5
وَلَا تَمْنُن تَسْتَكْثِرُ	اور (اس غرض سے کسی پر) احسان نہ کریں کہ اس سے زیادہ کے طالب ہوں	6
وَبَنِينَ شُهُوداً	اور (محبت کے) گواہ رہنے والے بیٹے (دیئے تھے)	13
وَمَهَّدتُّ لَهُ تَمْهِيداً	اور میں نے اسے (سامانِ زندگی میں) خوب وسعت دی تھی	14
كَلَّا	ہرگز (ایسا) نہ ہوگا	16
لَوَّاحَةٌ لِّلْبَشَرِ	(وہ) انسان پر (حقیقت) آشکارا کر دینے والی ہے	29
لِمَن شَاء مِنكُمْ أَن يَتَقَدَّمَ أَوْ يَتَأَخَّرَ	اس شخص کے لیے جو تم میں سے (نیکی میں) آگے بڑھنا چاہے یا (بدی میں) پیچھے رہ جائے	37
إِلَّا أَصْحَابَ الْيَمِينِ	سوائے دائیں جانب والوں (راست بازوں) کے	39
نَخُوضُ مَعَ الْخَائِضِينَ	بیہودہ مشاغل والوں کے ساتھ (مل کر) ہم بھی بیہودہ مشغلوں میں پڑے رہتے تھے	45
أَن يُؤْتَى صُحُفاً مُّنَشَّرَةً	کہ اسے کھلے ہوئے (آسمانی) صحیفے دے دیئے جائیں	52
هُوَ أَهْلُ التَّقْوَى	وہی تقویٰ (و پرہیزگاری) کا مستحق ہے	56

اگر ہم کچھ دیر ٹھہر کر تختی میں دیئے ہوئے ایک ایک لفظ اور کلمے پر غور کریں تو ہم ان میں موجود بے شمار جہات اور تہہ داریوں کا ادراک کر سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر تختی میں موجود پہلے کلمہ 'قُمْ فَأَنذِرْ' ہی کو لے لیں جس کا ترجمہ علامہ اسد نے ''اٹھیں اور ڈرائیں'' کیا ہے، یہ حکم 'قم' کے معنی میں استعمال ہو سکتا ہے۔ ایک معنی ''اٹھیں''، ایک اور ''چلیں''، یا ''کام شروع کریں'' یا ''اپنی تیاری کریں'' وغیرہ۔ اسی طرح 'انذر' کے معنی ''پیغام پہنچا دیں''، یا ''آنے والی قیامت کی گھڑی سے خبردار کر دیں، یا ''اس دنیاوی زندگی کی سزا (مکافاتِ عمل) سے بھی خبردار کر دیں'' یا ابد آباد تک جہنم کی آگ میں پڑے رہنے سے ڈرا دیں'' وغیرہ۔ اسی طرح کلمہ 'هُوَ أَهْلُ التَّقْوَى' جس کا ترجمہ علامہ اسد صاحب نے ''وہی خوف خدا کا مستحق ہے'' کیا ہے، اپنے جلو میں کئی اور تشریحی امکانات سے پُر ہے۔ اسم 'وَأَهلُ' کسی چیز کے مالک، یا اس کا دینے والا، یا کوئی شخص جو اسے لینے کا مستحق ہے، یا اس کی عطا کا اختیار رکھنے والی ہستی کی طرف اشارہ کرنے والا لفظ ہے۔ اگر لفظ تقویٰ پر غور کریں تو اس کے لغوی معنی کی حدود میں خوف، خطرہ کا احساس اور کسی امکانی نقصان سے پہلو بچانا جیسے کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کی سزا سے بچنے کے لیے اس کی ذات والا شان پر پکا ایمان لانا۔ یہی لفظ 'احتیاط' بچاؤ یا حفاظت کا حوالہ بھی ہو سکتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے والے اس کی سزا سے محفوظ ہو جائیں گے یا دنیاوی بلاؤں اور آفتوں سے اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں آ جانا وغیرہ۔

وسعت زبان اور بلاغت کی جو دولت وفراوانی ہمیں 'سورۃ المدثر' میں نظر آتی ہے، اس سے ہمیں یہ اندازہ بھی بخوبی ہو جاتا ہے کہ اس قسم کی زبان، بشمول اپنے انفرادی الفاظ اور تاثرات، کس قدر زبردست حد تک قرآن کی دوسری سورتوں میں پائی جانے والی زبان پر بھی حاوی ہے۔ اس حقیقت کے ساتھ ساتھ یہ امر بھی ملحوظ خاطر رہے کہ اس وسعت زبان یا بلاغت کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اس قسم کے الفاظ کو قرآنی زبان کی کمزوریاں تصور کر لیا جائے جن پر کوئی بھی ناقد قرآن اور منکر حق تحریف کا کلھاڑا چلا کر قرآن کے پیغام ہدایت کو تبدیل یا مسخ کر سکے۔ اس قسم کے لوگ گزشتہ کئی صدیوں سے ایسی کوشش کرتے رہے ہیں اور اب بھی کر رہے ہیں۔ کسی قسم کی کمزوری ظاہر کرنے کے برخلاف زبان کی یہ نمایاں خوبی قرآن کے مفاہیم کو وقت

گزرنے کے ساتھ ساتھ انسانی علم میں اضافہ، انسانی تہذیب و ماحول میں تبدیلی اور ارتقا کے باعث، مزید واضح، قوی اور ناقابل تحریف بنا دیتی ہے۔

قرآن کے مختلف طریقہ ہائے تلاوت اور بلاغت زبان

تلاوت قرآن کے تسلیم شدہ مختلف طریقے 22 وسعت زبان کی بہترین مثالوں میں سے ایک ہے۔ درحقیقت یہ ایک ایسا وصف ہے جو پوری انسانی تاریخ میں کسی اور کتاب میں موجود نہیں ہے۔ مستشرقین اور انہی کی قبیل کے دوسرے لوگوں نے بھی قرآنی زبان کے اس معجزاتی پہلو پر اختلاف اور بحث، مباحثہ کو ہوا دینے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ اس سلسلہ میں بہت طویل مقالات لکھے گئے ہیں اور اس سلسلہ میں کام کرنے والوں کو دل کھول کر مالی امداد بھی فراہم کی گئی ہے تاکہ کسی طرح اپنی بیجا تنقید اور قرآن کی حقانیت و علمی برتری کو جھٹلانے کے لیے جواز مل سکے۔ حالاں کہ طرفہ تماشہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے خود اپنی تحقیق پر ذرا سا توقف کر کے، پوری دیانتداری سے غور و خوض کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی جبکہ اسی تحقیقی مطالعہ سے ہم مشرقی لوگوں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ اگر وہ واقعی غور کرتے تو انہیں بھی اعتراف کرنا پڑتا کہ قرآن کریم کی سات مختلف طرح کی قرأتیں اس عظیم الشان کتاب کی زبان کا ایک اور معجزاتی پہلو ہیں۔

کیا آپ نے کبھی سنا ہے کہ ایک ہی کتاب میں کئی کتابیں ہوں، یا کوئی متن جسے ایک سے زیادہ طریقوں سے پڑھا جا سکتا ہو، یا اس کے ایک سے زیادہ معنی نکلتے ہوں پھر بھی ان معنی میں نہ کوئی تضاد ہو، نہ ہی کوئی بے قاعدگی؟ قرأت کا یہ تنوع خود مسلمانوں میں کسی اختلاف رائے کا مظہر نہیں ہے بلکہ اصل بات یہ ہے کہ قرأت قرآن کے یہ مختلف انداز بھی حاکم اعلیٰ کی طرف سے آسمان سے ہی اترے ہیں تاکہ قرآن کی زبان اور اس کے پیغام کی قدر و قیمت میں اور اضافہ ہو، تلاوت میں آسانی ہو اور اس کی وسعت زبان کی فطرت کو اس طرح اجاگر کرے کہ یہ بدلے ہوئے وقت اور مقام کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال سکے۔ لہٰذا قرآنِ کریم کی سات متنوع قرأتیں اس کا ایک اضافی وصف ہیں جو صرف اور صرف اس آسمانی کتاب کی انفرادیت ہے۔ اگر ماہرین زبان اور قاریوں میں ان مختلف قرأتوں کے بارے میں کوئی اختلاف ہے بھی تو

وہ محض ذاتی ترجیح کا ہے کہ کسے کون سی طرز پسند ہے ورنہ ساتوں قرأتیں آسمان سے وحی کی صورت میں نازل ہوئی ہیں۔

حضرت عمر ابن الخطاب (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نے فرمایا، ''ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں میں نے ہشام بن حکیم کو سورۃ الفرقان (25) کی تلاوت کرتے سنا۔ انہیں سنتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ بہت سے الفاظ کا تلفظ انہوں نے اس طرح ادا کیا جسے میں نے رسول اللہ ﷺ کو ادا کرتے ہوئے کبھی نہیں سنا تھا۔ میں ان کی نماز میں دخل دیتے دیتے بس رک ہی گیا اور ان کی نماز ختم ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ نماز ختم ہوتے ہی میں نے ان کے کرتہ کا گریبان پکڑ لیا اور پوچھا، ''جو سورۃ ابھی ابھی میں نے تمہیں تلاوت کرتے ہوئے سنی ہے وہ تمہیں کس نے سکھائی ہے؟'' انھوں نے جواب دیا، رسول اللہ ﷺ نے مجھے اس طرح پڑھنا سکھائی ہے'۔ ''تم جھوٹ بول رہے ہو'، میں نے کہا: 'اللہ کی قسم رسول اللہ ﷺ نے تو مجھے دوسری طرح پڑھنا سکھائی ہے!' پھر میں انہیں رسول اللہ ﷺ کے پاس لے گیا اور کہا، یا رسول اللہ ﷺ، میں نے ان صاحب کو سورۃ الفرقان جس طرح پڑھتے ہوئے سنی ہے وہ اس طریقہ سے مختلف ہے، جس سے آپ نے مجھے سکھائی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے جواب دیا، ''انہیں چھوڑ دو، عمر''، پھر ہشام سے مخاطب ہوتے ہوئے فرمایا، 'ہشام، پڑھو، ہشام نے سورۃ کی تلاوت اسی طرح کی جیسا میں نے انہیں نماز میں پڑھتے ہوئے سنا تھا۔ تب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، یہ اسی طرح نازل ہوئی تھی'۔ پھر وہ میری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا، 'عمر' تم پڑھو'۔ تو میں نے سورۃ اس طرح پڑھی جیسی حضور نے مجھے سکھائی تھی اور حضور نے فرمایا، 'یہ اسی طرح نازل ہوئی تھی، یہ قرآن سبعة أحرف یعنی ''سات حروف'' میں نازل ہوا تھا، تو جو تمہیں سب سے آسان لگے اس طرح پڑھ لیا کرو''۔[23]

(اکتالیس علماء اکرام نے تجوید کے لحاظ سے قرأت کے سات مختلف انداز بیان کیے ہیں)

یہاں یہ بات خاص طور پر قابل لحاظ ہے کہ تلفظ اور لہجوں کی بناء پر قرآن کی تلاوت کے مختلف انداز (جن کی تعداد بھی سات تک پہنچتی ہے، اس وجہ سے ہیں کہ اس سلسلہ میں جن راویان حدیث کی روایات پر ہم نے ان تلاوتوں کی بنیاد رکھی ہے، وہ سب کی سب سات قاریوں

پر جا کر منتج ہوتی ہیں)۔ یہ ان سات حروف سے الگ ہیں جن کا ذکر اوپر کی حدیث مبارکہ میں آیا ہے۔ ''سات حروف'' (سبعة احرف) کا تعلق مقامی لہجوں اور ان مختلف تلفظات سے ہے جو تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ، جوان اور بوڑھے پڑھنے والوں میں ہوتا ہے۔ اس نکتہ کی وضاحت درج ذیل حدیث سے ہوتی ہے:

رسول اللہ ﷺ ایک مرتبہ حضرت جبرئیل علیہ السلام سے ملے 24 اور کہا ''اے جبرئیل! میں ایک ناخواندہ قوم کی طرف مبعوث کیا گیا ہوں، جن میں کچھ بوڑھے اور ضعیف ہیں، کچھ بالکل نوجوان ہیں، کچھ لونڈیاں ہیں اور کچھ ان میں مرد حضرات ہیں جنہوں نے اپنی پوری زندگی میں کوئی کتاب نہیں پڑھی ہے''۔ جبرئیل علیہ السلام نے جواب دیا، ''اے محمد ﷺ، قرآن سات تلفظات میں نازل ہوا ہے'' (لغوی اعتبار سے معنی ہوئے ''سات حروف میں'' 'علی سبعة أحرف') (اور ایک اور حدیث کے الفاظ کے مطابق:) ''تو انہیں ان سات مقامی لہجوں میں سے کسی میں بھی پڑھنے دیجئے''۔ 25

(مثلاً بعض ملکوں میں قاری حضرات ''یومنون'' کو ''ؤ منون'' اور ''مالک یوم الدین'' کو ''ملک یوم الدین'' پڑھتے ہیں۔ مترجم)

وسعت زبان اور سائنسی انکشاف

آج کے اس جدید دور میں سائنسی معاملات پر قرآن کی معجزاتی دقت نظر کے لاتعداد انکشافات ہو رہے ہیں اور ان انکشافات کا تعلق ان حقائق سے ہے جن سے انسان ماضی میں بے خبر تھا اور اسی کم علمی کی وجہ سے قرآنی الفاظ کے یہ نئے معنی صدیوں تک قرآن کی اس بلیغ اور پہلو دار زبان کے پروں کے نیچے پوشیدہ رہے جس زبان کے بارے میں ہم اس وقت بات کر رہے ہیں۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا ہے معنی کے یہ نئے انکشافات خدائی زبان کے اوصاف کے بے شمار پھلوں میں سے ایک پھل ہے اور ہمیں صحابہ کرامؓ کی اس دور اندیشی کا قائل ہونا چاہیے جس سے کام لے کر انھوں نے قرآن کو بغیر شخصی تفسیر و تاویل کے بالکل اصلی حالت میں اگلی نسلوں تک پہنچانے کا انتظام کیا۔ ان حضرات کے بعد آنے والے تابعین (جن میں قرآن

کے مفسرین اور مترجمین شامل ہیں) نے ایسی آیات کی تفسیر بیان کرنے کی کوشش کی جو ان کی سمجھ سے بالاتر تھیں، اور اس عمل میں انھوں نے بغیر کسی غلط مقصد یا بدنیتی کے، قرآنی الفاظ کے معنی کو بگاڑ کر لوگوں تک پہنچایا۔ اس تعلق سے کئی مثالوں میں سے ایک مثال پر ہم توجہ مرکوز کریں گے جو درج ذیل ہے:

وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ صُنْعَ اللَّهِ الَّذِيْ أَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ إِنَّهُ خَبِيْرٌ بِمَا تَفْعَلُونَ.

وَتَرَى (اور تم دیکھتے ہو) الْجِبَالَ (پہاڑوں کو) تَحْسَبُهَا (تم ان کے بارے میں گمان کرتے ہو) جَامِدَةً (ٹھہرے ہوئے) وَهِيَ (جبکہ وہ) تَمُرُّ (حرکت میں ہیں) مَرَّ (اس حرکت کی طرح) السَّحَابِ (بادل) صُنْعَ اللَّهِ (اللہ کی صناعی، ہنرمندی، تخلیق) الَّذِيْ أَتْقَنَ (جس نے کمال کو پہنچایا) كُلَّ شَيْءٍ (ہر چیز کو) إِنَّهُ (بیشک وہ) خَبِيْرٌ (وہ خوب اچھی طرح جانتا ہے) بِمَا (جو کچھ) تَفْعَلُونَ (تم کرتے ہو)۔ (النمل: 27:88)

جب میں نے پہلے پہل اس آیت شریفہ پر غور وخوض کیا تو حیران رہ گیا کہ کس قدر صاف اور سلیس انداز میں یہ حقیقت بیان کرتی ہے کہ پہاڑ بھی، زمین کی اپنے محور پر گردش کے ساتھ ساتھ، حرکت کر رہے ہیں جس طرح بادل آسمان میں اڑتے پھرتے ہیں۔ اس مطلب پر غور کرتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ میں اس آیت کا مطلب قرونِ اولیٰ کے مفسرین کے ہاں بھی دیکھوں کہ انھوں نے اپنے عہد کی محدود معلومات کی روشنی میں، جو انہیں اس زمین اور اس کے باقی کائنات سے تعلق کے بارے میں تھیں اس آیت کا کیا مطلب سمجھا تھا۔ اُس زمانہ تک کسی کو بھی زمین کی حرکت تو کیا، یہ تک علم نہیں تھا کہ زمین ایک گیند کی مانند گول ہے۔ مزید برآں، یہ تو مقابلتاً اور بھی جدید علم ہے کہ ماہرین ارضیات نے دریافت کیا ہے کہ زمین کی کئی پرتیں ہیں جن میں سے پہلی کو Crust (اوپری پتلی پرت) اور دوسری تہہ کو Mantle (موٹی تہہ یا پرت جو اوپری پتلی پرت کے عین نیچے ہوتی ہے) کہتے ہیں۔ Plate Tectonics (مختلف پرتوں کی حرکت کا عمل) نظریہ کے مطابق، زمین کی بالائی پرت ہر سال اپنے سے نیچے والی پرت Mantel سے کچھ سنٹی میٹر دور سرک جاتی ہے جس کی وجہ سے براعظموں کے فاصلہ میں بھی تغیر

ہوتا ہے (حوالہ کے لیے انوڈ ویگنر کا نظریۂ براعظمی حرکت دیکھ لیجئے جو ابھی سو سال پہلے ہی، 1912 میں پیش کیا گیا تھا اور اس وقت سائنس دانوں نے اس پر سخت تنقید کی تھی یہاں تک کہ 1950 میں ایسی شہادتیں مل گئی جنہوں نے اس نظریہ کی حمایت کی)۔

ذیل میں ان کوششوں کا خلاصہ ہے جو قرونِ اولیٰ کے انتہائی ممتاز مفسروں میں سے چند نے اس آیت 27:88 کا مطلب بیان کرنے کے لیے کیں:

الخازن: ''پہاڑ، بادلوں کی طرح حرکت کرتے ہیں یہاں تک کہ وہ زمین پر آ رہتے ہیں اور اور سپاٹ وہموار ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح قیامت کے دن پہاڑوں کی حرکت ان کے عظیم اجسام کی وجہ سے غیر محسوس ہوگی، بالکل ایسے ہی جیسے بادلوں کی حرکت اسی وجہ سے ہمیں محسوس نہیں ہوتی''۔ الطبری (النسفی، ابن الجوزی، الزمخشری اور القرطبی بھی ان کے ہم خیال ہیں): ابن عباس سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ لفظ ''جامدۃ'' اس آیت میں مضبوطی سے قائم یا 'ایستادہ' کے معنی میں ہے، جہاں تک کلمہ وَهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ کا تعلق ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ (قیامت کے روز) پہاڑ جمع کیے جائیں گے، پھر اس طرح چلائے جائیں گے کہ دیکھنے والوں کو ان کے جم غفیر کی وجہ سے ایسا لگے گا جیسے وہ پہاڑ ساکت ہیں جب کہ وہ تیزی سے چل رہے ہوں گے''۔ الرازی (البیضاوی بھی ہم خیال ہیں): (''قیامت کے روز) پہاڑوں کے ساکت وجامد محسوس ہونے کی وجہ یہ ہوگی کہ جب بڑے بڑے اجسام ہم آہنگی کے ساتھ تیزی سے حرکت کرتے ہیں تو دیکھنے والوں کو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ ساکت ہوں، حالاں کہ وہ انتہائی تیز رفتاری سے گزر رہے ہوتے ہیں''۔

ابوحیان: ''بتایا گیا ہے کہ دیکھنے والے کو پہاڑ (جامدۃ) 'ساکت' اس لیے نظر آئیں گے کہ اس دن (قیامت کے دن) کی ہولناکیوں کی وجہ سے دیکھنے والے کے اوسان خطا ہو جائیں گے۔ دوسرے الفاظ میں اس کا دماغ ہی حاضر نہیں ہوگا کہ وہ سمجھ سکے کہ پہاڑ درحقیقت ساکت نہیں کھڑے ہیں''۔

ابن کثیر: ''یعنی، تمہیں ایسا نظر آئے گا جیسے وہ ساکت اور غیر متحرک ہیں جب کہ حقیقت میں وہ بادلوں کی طرح گزر رہے ہوں گے، یعنی اپنی جگہ سے ہلا دیئے جائیں گے''۔

الفراغ (اورالاخفش الاوسط بھی): ان مفسرین نے اس آیت کی کوئی تفسیر بیان نہیں فرمائی۔

سب سے زیادہ پریشان کن بات یہ ہے کہ کچھ جدید دور کے مفسرین قرآن بھی اسی مقام پر جمے رہنے پر مصر ہیں جس پر صدیوں پرانے قرون اولیٰ کے علماء پہنچے تھے اور اس تفسیر پر مطمئن بھی ہیں جو بیچارے قدیم علماء اپنی اس وقت کی محدود معلومات کی روشنی میں کر سکتے تھے۔ مثال کے طور پر اگر ہم دس جدید تفاسیر قرآن کو لیں جو انگریزی میں لکھی گئی ہیں (ان میں سے آٹھ مسلمان مصنفین کی اور دو غیر مسلم مستشرقین کی ہیں) تو ہم دیکھتے ہیں کہ آٹھوں مسلم حضرات کی تفاسیر (بلکہ یہ کہنا زیادہ بجا ہوگا کہ عربی تفاسیر کو انگریزی میں ترجمہ کرنے والے) بری طرح انہی مطالب و تفاسیر سے چمٹے ہوئے ہیں جو قدیم مفسرین نے کی تھیں۔

نتیجتاً، آیت کے اس حصہ وَهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ (جب کہ وہ چل رہے ہیں جیسے کہ بادل چلتے ہیں) کو جیسا کہ وہ ہے اسی طرح نہیں چھوڑا گیا ہے۔ تغیر کرتے وقت یہ لازم سمجھا گیا ہے کہ اس کا اطلاق زمانہ مستقبل میں ہی ہونا چاہیے۔ یہ ایک ایسا اقدام ہے جس کی وجہ سے انگریزی زبان میں تفسیر پڑھنے والا اس کلمہ کے حقیقی معنی تک رسائی حاصل ہی نہیں کر سکتا۔ (یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ محترم احمد بسام ساعی عربی اور انگریزی داں ہیں اس لیے اردو زبان کی تفاسیر کا حوالہ نہیں دیا۔ مترجم) کم از کم یہ تمام تفاسیر مُصر ہیں کہ اس کلمہ کا ترجمہ ''اڑ رہے ہوں گے'' ہی کیا جائے بجائے اس کے کہ: وہ اڑ رہے ہیں یا حرکت کر رہے ہیں۔

اسی مثال پر مزید غور کریں تو ہمیں پتہ چلے گا کہ جدید زمانہ کے مترجمین قرآن نے اس آیت کے فعل 'تَحْسَبُهَا' (تم گمان کرتے ہو یا تم خیال کرتے ہو) کا ترجمہ کرنے میں حیرت انگیز تضاد کا شکار ہوتے ہوئے بجائے زمانہ حال کے زمانہ مستقبل میں اس کا ترجمہ کیا ہے۔ فعل 'تَحْسَبُهَا' زمانہ حال کا ایک کام ظاہر کر رہا ہے، نہ کہ زمانہ مستقبل کا، ورنہ اس کا مطلب ہی فوت ہو جائے گا۔ اس کے باوجود جدید مفسرین کی اکثریت اس فعل حال (مضارع) کو فعل مستقبل میں رکھنے پر متفق ہے۔ چند مترجمین (مثلاً ہلالی اور خان وغیرہ) نے، اس تضاد سے بچنے کے لیے کہ اس آیت کے کچھ حصہ کو تو مضارع (حال) میں رکھتے ہوئے ''تم گمان کرتے ہو'' ترجمہ کریں اور دوسرے حصہ کو (''اور وہ بادلوں کی طرح اڑ رہے ہوں گے'' صیغہ مستقبل میں ترجمہ

کریں، اس آیت کے درست ترجمہ کو مزید مسخ کرتے ہوئے آیت کے ان دونوں حصوں کو زمانہ مستقبل میں رکھ دیا ہے۔ 'تَحْسَبُهَا' اور اس کے فوراً بعد آنے والے کلمہ 'وَهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ' کا ترجمہ یوں کیا ہے: اور تم پہاڑوں کو دیکھ کر گمان کرو گے کہ وہ جامد ہیں، مگر وہ چل رہے ہوں گے جیسے بادل چلتے (اڑتے) ہیں'' (فعل مستقبل کو واضح کرنے کے لیے خط کشیدہ کر دیا گیا ہے)۔

اسے خوش نصیبی ہی سمجھئے کہ غیر مسلم برطانوی مستشرقین رچرڈ بیل صاحب قرونِ اولیٰ کے مفسرین کے اثر سے آزاد تھے جب انھوں نے قرآن کریم کا ترجمہ کرنے کا بیڑا اٹھایا (جو 1939-1937 میں مکمل ہوا)۔ انھوں نے (قرآن کے متن کو چاہے جدیدیت کی آنکھ سے نہ بھی دیکھا ہو)، کم از کم عربی صرف ونحو کے قواعد کو نگاہ میں ضرور رکھا۔ لہٰذا، محض ان اصولوں کے مدنظر انھوں نے اس آیت کا ترجمہ بجائے فعل مستقبل میں کرنے کے، فعل حال میں کر کے ایک بالکل درست ترجمہ یوں پیش کیا: ''اور بظاہر پہاڑ جامد نظر آتے ہیں، حالاں کہ وہ بادلوں کی طرح چل رہے ہیں''۔

مسلم مترجم محمد مارمیڈیوک پکتھال صاحب نے بھی رچرڈ بیل کی پیروی کرتے ہوئے اس آیت کا ترجمہ یوں کیا ہے، ''اور تم پہاڑوں کو دیکھتے ہو (اور) تم انہیں جامد گمان کرتے ہو جب کہ وہ بادلوں کی اڑان کی طرح اڑ رہے ہیں''۔ (اشاعت اول 1930'' مگر اس نمونہ کے لیے نظر ثانی شدہ اشاعت 2002 لی گئی)۔

مختصراً اوپر دی ہوئی مثال ہمیں ایک صاف اور واضح تصویر اس صورت حال کی دکھاتی ہے جس میں قرآن کریم کا ایک شاندار اور معجزاتی پہلو آشکارا ہونے کے بجائے پوشیدہ رہا۔ یہ اس وجہ سے کہ چند مترجمین نے قرآن کا انگریزی میں ترجمہ کرتے وقت صدیوں پرانے مفسرین کی تفسیر کی من وعن نقل کرنے کی ٹھانی اور یہ حقیقت بالکل فراموش کر دی کہ قدما نے اپنے فہم قرآن کی بنیاد اس محدود علم پر رکھی تھی جو اس زمانہ میں انہیں حاصل تھا۔

آخر میں قرآن کریم کی زبان میں معجزاتی جدت طرازیوں کے مطالعہ کے اس پہلے سفر کے اختتام پر پہنچ کر مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی باک نہیں کہ یہ نئی حقیقتوں کی تلاش کی خاطر

محض ایک انسانی 'مہم' تھی، جو دوسری اسی قسم کی کاوشوں کی طرح جو خواہ کتنی بھی سائنسی، علمی یا نظریاتی محسوس ہوں، خام اور تشنہ ہی رہتی ہیں۔ قرآن کریم کی ماورائی زبان کے گہرے مطالعہ کی کوئی بھی انسانی کوشش ایک ''مہم'' سے زیادہ کسی درجہ کی مستحق کبھی بھی نہیں ہو سکے گی، اور ہو بھی کیسے سکتی ہے جب موضوع مطالعہ، کمال درجہ کی آسمانی تقریر اور طرز بیان ہو جس میں نہ تو کسی بھی قسم کی کوئی کمزوری یا خامی ہو اور نہ ہی کسی قسم کے جھوٹ یا سہو کا شائبہ بھی ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے عربوں کو جو چیلنج آسمان سے دیا گیا تھا، اسی معیار کی ایک سورۃ تم بنا لاؤ.....(علامہ اسد)، یا....ایسی ہی کوئی سورۃ بنا کر دکھاؤ'' (عبداللہ یوسف علی) (سورۃ بقرۃ 2:23) اسی طرح آج بھی تر و تازہ ہے جیسے کہ قرآن ابھی کل ہی نازل ہوا ہو۔ گزشتہ چودہ صدیوں میں خواہ کیسی بھی اعلیٰ وارفع ذکاوت و دانش نے اس دنیا کو متاثر کیا ہو، وہ ذکاوت یا دانش، قرآن کو اس کے اعلیٰ ترین مقام سے نہیں ہٹا سکی۔

ملاحظات

1۔ فخر الدین رازی، التفسیر الکبیر (بیروت: دار الاحیاء التراث العربی 2001) حصہ 9، صفحہ 446۔

2۔ جلال الدین السیوطی، الاتقان فی علوم القرآن (بیروت: دار الکتب العلمیۃ، 2003) حصہ دوم، صفحہ 108۔

3۔ سورۃ النحل 16:60، اے، جے، آربیری، The Quran Interpreted (نیویارک: میکملن، 1995۔

4۔ یہ بیان الحکم کی المستدرک علی الصحفیین میں روایت ہوا ہے۔ قرآن کے بارے میں دوسرے مشرکین کے بیانات سمیرہ الزاید نے مختصر الجامع فی السیرۃ النبویۃ میں لکھے ہیں (دمشق: المطبع العلمیۃ، 1995۔

5۔ زمانہ قبل اسلام کی شاعری پر دستاویز لکھتے وقت میں نے زیادہ تر شاعری کی انسائیکلوپیڈیا (جو CD کی شکل میں تھی) جسے متحدہ عرب امارات کی ثقافتی اکیڈمی نے ترتیب دیا ہے، پر بھروسہ کیا ہے۔ یہ انسائیکلوپیڈیا متعدد اشاعتوں میں جاری ہوئی ہے۔ پہلی بار 1998 میں، دوسری بار 2000 میں اور تیسری بار 2003 میں طبع ہوئی۔ رکارڈ کے لیے مجھے کہنا پڑے گا کہ اس انسائیکلوپیڈیا کے بغیر میں یہ تحقیقی مطالعہ مکمل نہیں کر سکتا تھا۔

6۔ یہ مثال اس اعلان سے لی گئی کہ وَلَمْ يَكُن لَّهُ كُفُوًا أَحَدٌ، جس کے معنی اس طرح بیان ہوئے ہیں، ''کوئی ایسا نہیں جو اس جیسا ہو (سورہ اخلاص 112:4)۔ منفی فعلیہ کلمہ 'لم یکن' جس کا ترجمہ ''کوئی نہیں ہے'' کیا گیا ہے، دراصل تمام زمانوں پر محیط ہے اور یوں کہنا چاہیے ''نہ کوئی تھا، نہ کوئی ہے، نہ کوئی ہوگا''۔ اس طرح اس کلمہ کے معنی محض صیغۂ ماضی تک

محدود نہیں ہیں جیسا کہ اس فعل کے انسانی زبان میں استعمال کی صورت میں ہوں گے۔

7۔ حضرت سعد بن ابی وقاص کی سند کے ساتھ حدیث کے مطابق، سیر اعلام النبلاء الذہبی۔

8۔ ان بیانات کے مصنفین یہ ہیں: (1) ابن المقفی، کلیلہ ودمنہ، ص 68، (2) ابن حزم، طوق الحمامہ، ص 216، (3) طٰہٰ حسین، فی الادب الجاہلی، ص 315، (4) المعری، رسائل ابی الاعلیٰ المعری، جلد 3، ص 587، اور (5) الرفیعی، وحی القلم، جلد 1، ص 16۔

9۔ درست تلفظ اور تجوید کے حکم قواعد کے مطابق قرآن کی تلاوت کا فن۔

10۔ جیفری لینگ، Even Angels Ask: A Journey in America (Beltsville, MA: Amama Publications, 1997, p.139)

'آربیری حوالہ آرتھر جے آربیری کی تفسیر، 'The Koran Interpreted' (آکسفورڈ یونیورسٹی پریس میں طبع شدہ 1964)، تعارف ڈینی حوالہ فریڈرک ڈینی کی کتاب، 'اسلام' (نیویارک: ہارپر اینڈ روپبلشرز، 1987)، ص 88۔

11۔ ابوزکریا یحییٰ بن شرف النووی، ریاض الصالحین، عبدالعزیز رباح اور احمد یوسف الدقاق، (دمشق: دارالمامون للتراث، 1980، ص 4۔

12۔ امام احمد کی روایت (احمد بن حنبل، مسند)۔

13۔ اس آیت کے ترجمہ میں دونوں محترم حضرات علامہ محمد اسد اور جناب عبداللہ یوسف علی کے تراجم و (تفاسیر) سے ہٹ کر میں نے اپنا ذاتی ترجمہ پیش کیا ہے۔

14۔ کرسٹوف لکنز نبرگ: The Syro-Aramic Reading of the Koran: A Contribution to the Decoding of the Language of the Koran, (برسن: ورلانگ ہانز شلر، 2007)

15۔ حرف مصدری کی ایک مثال 'ان' ہے جس کے بعد فعل مضارع (زمانہ حال) کے لفظ پر زبر (عربی نصب) آتا ہے، یا زمانہ ماضی کی شکل میں فعل آتا ہے، کہہ سکتے ہیں، ''اس کے جانے کے بعد'' (بعد أن يذهب)۔ 'اُن' کے دونوں طرح کے استعمالات میں جس میں 'اُن' کے فوری بعد فعل آرہا ہے، 'اُن' کو مصدر سے تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ یوں (بعد أن

ذهب)(اس کے جانے کے بعد) کے بجائے کوئی یہ بھی کہہ سکتا ہے 'بعد ذهبه' (لغوی معنی ''اس کی روانگی کے بعد'')۔

16۔ علامہ اسد اس کلمہ کا ترجمہ یوں کرتے ہیں کہ ''اللہ تعالیٰ نے اسے (اس قوم کو) بھوک اور خوف کی مصیبت کے پوری طرح ڈھانپ لینے والے لباس کا مزا چکھایا اور ذیلی نوٹ میں اس حوالہ سے تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''جس طرح بدنصیبی انسان کو لباس کی مانند چمٹ جاتی ہے'' (تاج العروس)۔ دیکھئے علامہ محمد اسد کی تفسیر The message of the Qur'an، دارالاندلس، 1984)، ص414، :Gibroltar)

17۔ الشوکانی: تفسیر فتح القدیر
(قاہرہ: دارالفکر، تاریخ نہیں دی ہے)، جلد3، ص200۔

18۔ السکا کی، مفتاح العلوم (بیروت: دارالکتب العلمیۃ، 2000)، ص298۔

19۔ حکیم کی روایت۔ اسی طرح کے اور بہت سے بیانات کے لیے جو حضرت عمرؓ سے متعلق ہیں، دیکھئے جلال الدین سیوطی کی 'جامع الاحادیث لاتمساند والمراسل، مؤلفین احمد عبدالجواد اور عباس احمد سقر (دمشق: مطبع محمد ہاشم القطبی 1981)، مساند (مسند کی جمع) کے حصہ میں، جلد2، ص145-143۔

20۔ عربی ترجمہ جس ایڈیشن سے لیا گیا ہے اسے دارالکتاب المقدس فی العالم العربی نے طبع کیا ہے، 1981۔

21۔ دارالکتاب المقدس فی العالم العربی، 2004 ایڈیشن۔

22۔ دیکھئے احمد علی الامام کی Variant Readings of the Qur'an: A Critical Study of Their Historical and Linguistic Origins (Malta: IIIT, 2011.

23۔ الفاظ کے تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ امام بخاری اور امام مسلم دونوں نے روایت کی ہے۔ اس موضوع پر مزید احادیث کے لیے ان کتابوں کا مطالعہ کیجئے جو قرآن کی مختلف تلاوتوں کے موضوع پر لکھی گئی ہیں، خاص طور پر ابن الجزری کا تعارف (تاریخ ہجری 833

اور 1429 عیسوی)، تقریب النشر فی القرأت العشر، ایڈیٹر ابراہیم عطوہ عوض، (قاہرہ: دارالحدیث، 1996)، ص 51-47۔

24۔ اس روایت کی ایک سند کے مطابق حضورﷺ حضرت جبرئیل سے ''الحرۃ'' کی چٹانوں پر ملے، جو قبا میں موجود ایک پہاڑ کی طرف اشارہ ہے (صحرۃ الحرۃ)۔

25۔ ابی بن کعب کی سند سے الترمذی کی ایک حدیث۔

منتخب حوالہ جات

درج ذیل فہرست میں مجموعہ احادیث، لغات، انسائیکلو پیڈیا، قواعد وصرف ونحو اور زبان پر مقالات یا قرآن کی وہ تفاسیر جن کا حوالہ ہم نے کتاب میں نہیں دیا ہے۔ شامل نہیں ہیں۔ نہ ہی اس میں وہ بے شمار انسائیکلو پیڈیاز شامل ہیں جو CD کی شکل میں تھیں اور جن پر ہمیں پورا اعتماد تھا۔ ان میں قرآن کریم کی انسائیکلو پیڈیا، حدیث اور عربی شاعری، خاص طور پر 1998، 2000 اور 2003 ایڈیشن کے اہم انسائیکلو پیڈیا (CD میں) شامل ہیں جنہیں متحدہ عرب امارات کی ثقافتی اکیڈمی نے مرتب کیا ہے۔

عربی حوالہ جات

☆ طہ جابر العلوانی۔ نحو موقف قرآنی من النسخ (قاہرہ: مکتبہ الشروق الدولیہ، 2007)

☆ أحمد مکی الانصاری۔ نظریات النحو القرآنی (جدہ: دار القبلۃ 1405 ہجری/ 1984ء)۔

☆ ابو بکر أحمد بن الحسین الأصبہانی، المبسوط فی القرأت العشر، ایڈیٹر حمزہ حاکمی سبیع (جدہ: دار القبلہ اور بیروت: مؤسسۃ علوم القرآن، 1995)۔

☆ القاضی ابو بکر محمد بن الطیب الباقلانی۔ اعجاز القرآن، تدوین اور اعراب شدہ صلاح بن عویضہ (بیروت: دار الکتب العلمیہ 2001)۔

☆ عبد الحمید الفراہی۔ تفسیر نظام القرآن وتأویل الفرقان بالفرقان (ہندوستان: الدائرۃ الحمیدیہ 2000)۔

☆ محمد ابن محمد ابن الجزری۔ تقریب النشر فی القرأت الحشر، تدوین ابراہیم عطوہ عوضی، (قاہرہ: دار الحدیث 1996)۔

☆ عبدالقاہر الجرجانی۔ دلائل الاعجاز، محمود محمد شاکر کے تبصرہ کے ساتھ، (قاہرہ اور جدہ: دار المدنی 1992) الکتاب المقدس (بیروت: دار الکتاب المقدس فی الشرق الوسط، 2004)۔

☆ الکتاب المقدس (دار الکتاب المقدس العالم العربی، 1981)، مناع القطان، مباحث فی علوم القرآن (بیروت: مؤسسۃ الرسالۃ 1998)۔

☆ الفخر الرازی. تفسیر الکبیر (بیروت: داراحیاء التراث العربی 2001)۔

☆ ابو یعقوب یوسف السکاکی۔ مفتاح العلوم، ایڈیٹر: عبدالحمید ہنداوی، (بیروت: دار الکتب العلمیہ 2000)۔

☆ محمد ابن علی الشوکانی۔ فتح القدیر: الجامع بین فنی الروایۃ والدرایۃ من علم التفسیر (قاہرہ: دار الفکر، تاریخ ندارد)

☆ جلال الدین السیوطی۔ الاتقان فی علوم القرآن، ایڈیٹر محمد سالم ہاشم، (بیروت: دار الکتب العلمیہ 2003)۔

☆ جلال الدین السیوطی۔ جامع الاحادیث لا لمسانید والمراسیل. مؤلف اور ناظم احمد عبد الجواد اور عباس احمد سقر، (دمشق: مطبعہ محمد ہاشم الکتبی، 1981)۔

☆ محمد عبدالخالق عقیمہ۔ دراسات لأسلوب القرآن الکریم (قاہرہ: دار الحدیث 2004)۔

☆ بدرالدین محمد ابن بہادر الزرکشی۔ البرھان فی علوم القرآن. ایڈیٹر: محمد ابوالفضل ابراہیم (قاہرہ: داراحیاء الکتب العربیہ 1958)۔

☆ سمیرۃ الذاید. مختصر الجامع فی السیرۃ النبویہ (دمشق: المطبع العلمیہ 1995)۔

انگریزی حوالہ جات

☆ محمد اسد۔ دی مسیج آف دی قرآن (برسٹل، انگلینڈ: دی بک فاؤنڈیشن، 2003)، جلد 5، صفحہ 758۔

☆ دی بائبل۔ کنگ جیمز ورژن (لندن: کولنز کلیر ٹائپ پریس، 1950)

☆ گونیوز فار ماڈرن مین: دی نیو ٹیسٹا منٹ ان ٹوڈیز انگلش ورژن (امریکن بائبل سوسائٹی، 1966)۔

☆ دی ہولی بائبل۔ روائز ڈ اسٹڈیز ورژن (ڈویژن آف کرسچین ایجوکیشن آف دی نیشنل کونسل آف دی چرچز آف کرائسٹ ان دی یو ایس اے گریٹ بریٹین، 1971)۔

☆ دی ہولی بائبل (لندن: ٹرینیٹرین بائبل سوسائٹی، 2000)

☆ امین احسن اصلاحی۔ یونڈرسٹنگ اوور دی قرآن، مترجم ایم ایس کیانی (لندن، 2003)۔

☆ جیفری لینگ، ۔ ایون اینجلز آسک: اے جرنی ٹو اسلام ان امریکہ (بیلٹس ویل، ماساچوسٹس: امانہ پبلی کیشنز، 1997)۔

☆ کرٹوف لکنز نبرگ۔ دی سائروارامک ریڈنگ آف دی قرآن: اے کنٹر بیوشن ٹو دی ڈی کوڈنگ آف دی لینگویج آف دی قرآن۔ انگلش ایڈیشن (جرمنی 2007)۔

☆ مڈلٹن مری۔ دی پرابلم آف اسٹائل (1922) (لندن: آکسفورڈ پیپر بیکس، 1960)۔

English References

- Asad, Muhammad, The Message of the Quran, Bristol (England), The Book Foundation, Vol.5, P.758
- Islahi, Amin Ahsan, Pondering over the Quran translated by M.S. Kayani, London: 2003
- The Holy Book. King James Version, Collins' Clear\Type Press. London: 1950
- Good News for Modern Man (The New Testament in today's English Version), American Bible Society: 1966
- The Holy Bible, Containing The Old and New Testament of the National Council of the Churches of Christ in the U.S.A. Great Britain: 1971
- The Holy Bible, Trinitarian Bible Soceity, London: 2000
- Luxenberg, Christoph, The Syro-Aramaic Reading of the Koran: A Contribution to the Decoding of the Language of the Koran. English Edition, Germany: 2007

- Murry, Middletion. The Problem of Styl, Oxford 1960
- Jeffery Lang. Even Angels Ask: A Journey to Islam in America (Bettsville, Massachusetts Amanah Pulications 1997

☆☆☆

قرآن: عربی زبان کا ایک زبردست معجزہ

زیرنظر کتاب اس حقیقت کو اجاگر کرتی ہے کہ کیوں قرآن کریم ایک منفرد و معجزاتی کتاب ہے اور اس بات کا ناقابل تردید ثبوت ہے کہ یہ خدائی حکم ہے۔ مصنف اس تحریر میں قرآن کریم کی زبان کا زمانۂ جاہلیت کی شاعری، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال (حدیث) اور گزشتہ و موجودہ عربی زبان سے موازنہ کرتے ہوئے اس بات کو واضح کرتے ہیں کہ اگرچہ قرآن کو عربی میں نازل کیا گیا، مگر ٹھیک اسی وقت یہ اپنی نوعیت کی بالکل نئی عربی تھی، اصل اور ابتدائی مسلم سامعین نے اسے معجزاتی زبان تصور کرتے ہوئے قرآن کے الفاظ، آوازوں اور خاص لحنوں سے تاثر قبول کیا اور وہ اس کے لسانی و صوتی جمال اور شوکت الفاظ کے مداح ہوگئے، لیکن چونکہ موجودہ انسانوں کے کان اسے بچپن سے سننے کے عادی رہے ہیں، اس لیے اپنے اطراف میں پھیلی ہوئی ہر قسم کی لغات و معاجم اور تحقیقات و مطالعات کے باوجود وہ اس وصف کے ادراک سے محروم ہیں۔

مصنف کی کوشش یہ ہے کہ اس پردہ کو ہٹا کر قرآن کریم کو سامعین کے سامنے اس طرح پیش کیا جائے گویا وہ اسے پہلی مرتبہ سن رہے ہیں، تاکہ زندگی میں اس اعجاز کی کچھ جھلک تو پیدا ہو سکے۔ اپنی اسی کاوش میں وہ قارئین کی رہنمائی قرآن کے جمال کی طرف کرتے ہوئے ان کے ذہنوں میں اس کی ساخت اور سلاست کے واضح تر تصور کو راسخ کرتے ہیں، اپنے تجزیہ کو مدلل کرنے کے لیے سورہ مدثر پر توجہ مرکوز کرتے ہوئے مصنف ہمارے سامنے وحی کو اس انداز میں پیش کرتے ہیں کہ یہ بات پوری طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ مجموعی نقشہ اور دائرے میں رہتے ہوئے ہر سورت اپنی منفرد خصوصیات اور مخصوص خوبیوں سے آراستہ ہے۔

AL ITTEHAD PUBLICATIONS

Al Ittehad Publication Pvt. Ltd.
B-35 (LGF), Nizamuddin West, New Delhi-110013
Ph.: +91-11-41827475, 24352732, Fax.: +91-11-24352048
E-mail.: alittehad@gmail.com

ISBN: 978-93-80946-27-6